

# ابن آدم

باتو قدسیه

## ابن آدم

جیلہ اب کینچوے کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے سوچنے لگی تھی۔  
 کبھی دل میں خیال اٹھتا کہ بے جی کو ان کے کئے کی سزایوں نہ ملی؟ اللہ آخری لمحے تک ان پر کیوں مہربان رہا؟ پھر اس خیال پر گہرا پچھتاوا اٹھتا کہ میں بھی کیسی اولاد ہوں، اپنی ماں کے لئے میرے دل میں کیسے برے برے خیال اٹھتے ہیں۔ میں ان کی سزا کے لئے کیسا التا ارمان رکھتی ہوں۔

ایسے میں جیلہ احساس جرم تلے پستی، اپنے سے جھگڑتی اور بھر جھلا جھل فرافر آنسو اس کے گالوں پر پھیلتے۔ بہت سال سے دولت کی ریل پیل نے اس کے مسائل آسان کر دیے تھے اور آنسو وافر تعداد میں یوں نہ بہتے تھے.....

لیکن بے جی کو معاف نہ کر سکنے پر اس کے دل میں اپنے ہی خلاف غم و غصے کی جو کیفیت اٹھتی، اس پر بھی اتنا اختیار نہ تھا۔ ایسے میں اپنے آپ کو کوستی، ماں جی پر ترس کھاتی تو بے تحاشا آنسو فرش پر گرے لگتے۔ احساس جرم فتنہ پرور اسے پیٹنے لگتا۔

تب بھی سنگ مرمر کے چکنے فرش پر جا بجا جیلہ کے آنسو بوند بوند پھیلے تھے۔ شاید دفتر جانے لگا تو ڈیرنگ ٹیبل کے قریب بریف کیس رکھتے ہوئے اس نے پوچھا: ”یہ فرش پر پانی لے قلم لے کیسے ہیں، جیلہ؟“

جیلہ: ”تم، ہوان بچوں کی ماں، چپ چاپ پائنک پر لیٹی رہی۔ برسوں سے وہ ناشتے کی میز پر نہ جاتی تھی۔ شاہد کب اور کیسے تیار ہو کر بزنس آفس جاتا اس کی اسے خبر نہ تھی۔“

”اپنے پیارے ملازموں سے کہنے جب پانی اندر لائیں تو احتیاط برتیں۔ فرش کی

اس روزِ نسبتِ روئے چہ ول پپ میں آگ لگی، شاہد بہت ادا اس تھا۔ اسی روز

کر شل اور چپس کا عمدہ گنزر کیا۔

لیکن جیلہ اور اس کے کامیاب شوہر کو علم نہ تھا کہ انسان بھی کبھی کبھی وقت گزرنے پر ان فیشن نہیں رہ سکتا۔ اس کی کامیابی کا عہد بھی گزر جاتا ہے۔ جب بیلہ کا کچھ

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پیچھے ہوا۔ اس نے تین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر بریف کیس رکھ دیا اور اٹھالوی صوفے پر سر ٹیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جیلہ اس پُر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

”کیا ہوا شاہد؟“

”کچھ نہیں..... بس۔“ شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ ”ایک اور نقصان۔“ وہ

منمنایا۔

”پھر بھی کچھ تو بتائیں؟“ جیلہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ برسوں کی کامیابی نے ان میں ایسی خجستہ دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔

”نسبت روڈ والے پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی۔“ وہ جیلہ کے اس قدر قریب نہ تھا کہ اسے ہول برگ والے مقدمے کا بھی بتا سکتا۔

جیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ابھی دوپہر کی ڈاک سے بچوں کا خط اسے ملا تھا اور وہی دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچوں والی بات شاہد کو معلوم نہیں، حالانکہ بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گرم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دونوں کے درمیان ایسی برف لگی حدود قائم نہ پہلی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی گنجائش نہ تھی..... خاموشی کا لحد

میں ایک لمحہ لگتا تھا۔

”ابن علیؑ، یا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔“

”ابن علیؑ، یا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔“

”ابن علیؑ، یا شاہد، وہ پھر دے گا..... وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔“

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان ہٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: ”شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھٹا، ٹونا سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔“

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ ”تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا شکر کھایا ہے..... میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا..... جو مشکلات، ذلتیں، کھٹنیاں میں نے برداشت کیں..... میری ان تھک کوشش..... وہ..... سب اکارت گئی.....“

جیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر اچانک اس کے منہ سے نکلا..... ”کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش..... تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی..... اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ چاہتا تو.....“ یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

”مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں..... میں ہی کیوں؟..... اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے کیوں چنایا گیا؟“

جیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی..... ”شاہد! ہو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتتے کو تیار ہوں، وہی یہ وال پوچھ سکتے ہیں کہ ”میں ہی کیوں؟“ جہاں کامیابی کا سرا اپنے سر اور ناکامی کا الزام وہ سبوں پر..... وہاں ”میں ہی کیوں“ نہیں پوچھا جاسکتا۔ ہم لوگ انا کے ماہے، شجی..... نہیں تو لہوئی بڑا ”قربانی کا بکرا“ چاہیے، بڑی کھوئی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری اور لوٹ ٹاٹ لیں۔ اس قدر مضبوط نہ ہو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا..... تم اپنے اہل مال کا بدستبی کا بوجھ اس پر ڈال کر تو دیکھو..... یہ فیئر نکل جائے گا۔ یہ بڑا..... تم..... ہمارے کاش..... ہماری کوشش ضمنی ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو گی.....“

جیلہ نے سر ہلاتے ہوئے شاہد نے زور سے ماکارا۔ بڑے دھماکے خیز سڑوں نے سارا

ایک دن کے سروں پر شاہ نے زور سے مکھمارا۔ بڑے دھماکہ خیز سروں نے سارا

اس کا جواب دے گا کہ اس کی ناکھی نیلہ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس

انکار کر دیا۔ اس دن شاہد کی انا کا غبارہ بری طرح پگھل چکا تھا۔ اس نے مین ہال وے میں صوفے کے پاس فرش ہی پر برف کیس رکھ دیا اور اطالوی صوفے پر سرنیک کر خالی الذہن ہونے کی کوشش کی۔

جیلہ اس پر اعتماد شخص کو یوں دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

”کیا ہوا شاہد؟“

”کچھ نہیں..... بس۔“ شاہد برسوں کے بعد رونا چاہتا تھا۔ ”ایک اور نقصان۔“ وہ

منمنایا۔

”پھر بھی کچھ تو بتائیں؟“ جیلہ اس نے پاؤں دھو کر بڑی ہال میں لپٹی ہوئی بیٹھ گئی۔

”نہایت رونا دھری دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔“

”نہایت رونا دھری دوری پیدا کر دی تھی کہ وہ شاہد کے ہاتھ نہ پکڑ سکی۔“

جیلہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ابھی دوپہر کی ڈال سے پہلے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا اور وہی

دھکا اس کے لئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بات شاہد کو معلوم نہیں، حالانکہ

بچے فون پر ابو سے بات کر چکے تھے کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔

وہ گم صم شاہد کے پاس بیٹھی رہی۔ ان دنوں کے درمیان ایسی برف ملی ہوئی

قائم ہو چکی تھیں کہ کسی بے ساختگی، تجاوزات، من مانی کی نجاشت نہ تھی۔ خاموشی کا

صدیاں بن کر گزرا۔

”جس نے پہلے دیا شاہد، وہ پھر دے گا۔ وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔“

شاہد سارے کا سارا تڑپ گیا۔ ”تم ہر بات میں اپنے اللہ کو بیچ میں نہ لیا کرو۔“ یہ

مولوی پنا چھوڑ دو جیلہ! یہ سب طفل تہلی ہے۔“

اس کامیاب کاروباری ٹانگی کون کی ٹانگی جیلہ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس

اس گھڑی لندن والے بچے بھول گئے۔ اس کا خیال تھا کہ شاہد کا سارا اپنے سینے سے اٹا لے

لیکن شاہد کی سطح کے پاس زدہ آدمی کو کسی معمولی شکایت کی طرح تہلی، نہایت یا

تلقین نہیں کی جاسکتی۔ شاہد جس طرح کامیابی میں بے عدیل تھا ویسے ہی اب ٹانگی میں ملی

طور پر تن تھا تھا لیکن جیلہ پر نہ جانے کیا کڑی۔ اس وقت اس نے ایک انتہائی غلطی

کی اور شاہد کا غم غلط کرنے اور اس کا دھیان ہٹانے کی خاطر اس کے منہ سے نکلا: ”شاہد! رزق اور عزت کا وہی ضامن ہے۔ رزق میں بڑھوتری ہو کہ گھٹا، ٹوٹا، سب اس کی طرف سے ہے۔ ہم کمزور گوشت پوست سے بنے لوگ اتنا وزن کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس کی پناہ لو شاہد، اس پر وزن ڈالو۔“

شاہد بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ ”تم ایسی باتیں کر سکتی ہو جیلہ کیونکہ تم نے محنت نہیں کی، تم نے میری محنت کا ثمر کھایا ہے۔ میں اپنی ساری محنت، تجویز، ہمت کو کیسے بھول جاؤں؟ یہاں تک پہنچنے میں مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا۔۔۔ جو مشکلات، ذلتیں، کٹھنایاں میں نے برداشت کیں۔۔۔ میری ان تھک کوشش۔۔۔ وہ۔۔۔ سب اکارت گئی۔“

جیلہ عام طور پر گفتگو کو مناظرے میں بدلنے سے پہلے خاموش ہو جایا کرتی تھی، پر

اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ”کوئی شخص از خود نہ تجویز کر سکتا ہے نہ کوشش۔۔۔

تمہارے پلان، کوشش، تجویز، اللہ کی عطا تھی۔ اس نے چاہا تو تمہیں کام کی توفیق ملی، نہ

چاہتا تو۔۔۔“ یکدم شاہد کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

”مجھے فلسفہ نہیں چاہیے۔ مجھے کسی مولانا صاحب کا دینی لیکچر بھی درکار نہیں۔ میں

صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ میں ہی کیوں؟ اتنی شکست، تباہی و ناکامی کے لئے صرف مجھے

کیوں چننا گیا؟“

جیلہ کم گو تھی، اس کے حسن نے عموماً اسے بڑی مراعات بغیر جھگڑے بہم پہنچائی

تھیں۔ وہ تند آواز میں بولی۔ ”شاہد! جو لوگ اپنے ہر عمل کی سزا بھگتتے کو تیار ہوں، وہی

یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ ”میں ہی کیوں؟“ جہاں کامیابی کا سارا اپنے سر اور ناکامی کا الزام

دوسروں پر ہو وہاں ”میں ہی کیوں“ نہیں پوچھا جاسکتا۔ ہم لوگ انا کے ماہرے، شیخی

نہیں تو کوئی بڑا ”قریبانی کا بکرا“ چاہیے، بڑی کھوئی جس پر ہم اپنی ناکامی کا بھاری

ادور لوٹ ٹانگ لیں۔ اس قدر مضبوط نہ ہو شاہد! وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت عطا کرتا

ہے۔ تم اپنے اہمال کا بد نتیجہ کا بوچھا اس پر ڈال کر تو دیکھو۔۔۔ یہ فیئر نکل جائے گا۔ یہ بڑا

وقت ختم ہو جائے گا۔ ہماری کوشش ضعیف ہے۔ وہ پھر توفیق دے گا۔ بڑی ریل پیل ہو

لی۔“

پہلے یہاں کے سروں پر شاہد نے زور سے مکا مارا۔ بڑے دھماکے خیز سروں نے سارا

گھر بھر دیا۔

”وہ..... وہ تمہارا خدا پلازے بنانے آیا تھا؟ سناک ایک پیچ پر وہ کلمہ لڑتا ہے؟ رات دن فیکٹریاں تمہارا رب چلاتا ہے؟ وہ بال سفید کرتا ہے اپنے سوچ سوچ لڑکے..... ٹھیک ہے گھنگو میں سارا کریڈٹ میں تمہارے خدا ہی کو دیتا ہوں، لیکن ڈونٹ فارکیٹ میں نے اتنی محنت کی ہے، اتنی محنت کی ہے.....“

شاید نے منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ جیلہ اس کا چہرہ دیکھتا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں شاید کے حصے کی معافیاں بھی گزر گزائے لگیں..... ”اللہ جی! یہ ناکامی کی آخری چٹان پر کھڑا ہے۔ اسے اس دیوانگی کی سزا نہ دینا پروردگار..... یہ سزا کا مستحق بھی ہو تو ات اللہ میاں جی صرف معاف ہی نہ کرنا بلکہ..... جزا دینا..... اس کے دن پھیر دینا..... اس کی تجویزوں نے، اس کی محنت نے ات چھوٹا سا فرعون بنا دیا ہے..... جو ہر کامیابی کو اپنے سے منسوب کرتا ہے..... میرے.....! ۱۰۰ اس Genius کو فرعون ہونے کی سزا نہ دینا..... اسے ناکامی کے دریا میں ڈبو نہ دینا میرے آقا.....“

اس روز کے مناظر نے لیلیٰ اور شاید نے فاسلے پتھر اور پتھر دیے..... دونوں سوشل فکشنوں پر پاس پاس اور تنہائی میں ایک..... سب سے دور دور رہتے تھے۔ شاید نے ایک بڑا سارا ٹھکرا کر اور سارے الزامات اپنے سر لے لیے۔ آپ کو تو نا شروع کر دیا کس وقت میں نے کون سی غلطی کی، کہاں چوب..... لی، کون سے فیصلے غلط تھے؟ وہ ایک بار پھر اپنی انا کے چھلاوے کے آگے احساس جرم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ ناکامی سے دوچار ہو کر وہ اپنے رب سے ناراض ہو گیا۔ لاڈلے بیٹے کی طرح اپنی من مانی کرتے رہنے لے بعد اس کا یہ خوف بھی جاتا رہا کہ اسے ملحق بھی کیا جاسکتا ہے!

جیلہ کو پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ اولاد نافرمان بھی ہو اور ٹائٹل گزار بھی لیکن دنیاوی والدین کی طرح اللہ اپنی مخلوق کو کبھی ملحق نہیں کرتا۔ جیلہ اور شاید جب بیتہ روم میں اکیلے ہوتے تو ان کی خاموشی سے ”اگر“ بیشہ دو کتبوں سے کھلتے..... ایک ساتھی کی رضامندی، دوسری اپنی فضا..... ان دو چابیوں نے خاموشی کے لیے بڑے لمبے لہجے لہجے دیے تھے خاموشی کے زحمتی دن سے نبرد آزما ہو کر ایک دن شاید بولا..... ”نابالک! پیچ کا اس حکومت نے بعد میں..... جو شیخ سو کا تھا اب دس پر ہے..... میرا ارادہ ہے کہ لیلیٰ

کی امیگریشن لے لوں۔ اب یہاں ساکھ بحال نہیں ہو گی جیلہ.....“

”بیٹیاں لندن بیاباں گئیں، بیٹا امریکہ میں پڑھ رہا ہے۔ آپ کینیڈا چلے ہیں؟ آپ کو جانا ہی ہے تو لندن چلے جائیں.....“

”لندن تو ایسی کساد بازاری میں جا رہا ہے کہ اللہ بچائے..... تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو نہ سہی۔ میری تو قسمت ساتھ چھوڑ گئی، تم کس شمار میں!“

”ہمیں ابھی بھی کسی چیز کی کمی نہیں شاید! گاڑیاں، کوٹھی، پیسے کی ریل پیل۔ اس بڑھاپے میں ہم کیوں جلا وطن ہوں؟ اللہ میاں سب ٹھیک کر دے گا شاید!“

وہ اس خیر خواہی سے بھڑک گیا۔ ”مہربانی فرما کر آپ اللہ میاں کی سفارش نہ کریں۔ آپ کا اللہ میاں کبھی آدمی تو رہا نہیں کہ وہ جان سکے جب انسان اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تھانیدار کے حواری بھی ہوں اور نیل بھی جھگتیں..... شادی بھی تیلی سے کریں اور کھائیں بھی سوکھی..... پیارے بھی ہوں اللہ کے اور ذلت بھی سہیں..... تو تھینک یو..... تو تھینک یو..... میں ایسے محبوب سے تنہا ہی بھلا۔ میں دوستی میں آزمائش کا قائل نہیں..... میں اگر کامیابی میں تھا تھا تو ناکامی میں بھی اکیلا رہوں گا۔“

پتہ نہیں یہ ڈھٹائی تھی کہ برسوں کی رفاقت..... جیلہ نے جرات کر کے کہا: ”شاید! ہر معاملے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تمہیں بتانے کی تو ضرورت نہیں لیکن شاید بات کا اعادہ کرنے سے کچھ فرق پڑ جائے جہاں روز ازل کیا ہوا تھا! لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ابلیس کا گناہ فقط تکبر ہے..... لیکن میرا خیال ہے کہ تکبر کا ماحصل مایوسی ہے۔ جب ابلیس اس بات پر مصر ہوا کہ وہ مٹی کے پتلے کو سجدہ نہیں کر سکتا تو وہ تکبر کی چوٹی پر تھا لیکن جب تکبر ناکامی سے دوچار ہوا..... تو ابلیس اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا..... حضرت آدمؑ بھی ناکام ہوئے، وہ بھی جنت سے نکلے گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے..... یہی تو ساری بات ہے۔ شاید! ابلیس نے دعویٰ کر رکھا ہے میں تیری مخلوق کو تیری رحمت سے مایوس کروں گا۔ ناامید، مایوس لوگ میرے گردہ میں داخل ہوں گے..... اللہ جانتا ہے کہ اس کے چاہنے والوں کا اغوا ممکن نہیں۔ وہ کنوئیں میں لٹکائے جائیں، آگ پر جلانے جائیں، صلیب پر لگیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوں گے.....“

پھر اچانک ایک واقعہ رونما ہوا۔ ایک ملٹی نیشنل فرم کے مالک نجم رضوان کے گھر ایک دعوت پر جانا پڑا۔ نجم اس قدر امیر تھا کہ اسے کسی عجب کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس چڑھتے، چوڑے کی تمام اچھی اور بری عادتیں اب سب کے سامنے تھیں۔ وہ اپنی کمینگی، ہرزہ گوئی، جھوٹ اور بے پرکی داستانیں سنا سنا کر لوگوں کو حیران کرتا رہتا تھا۔ اس کی دولت نے اسے انٹرنس دے رکھا تھا کہ وہ جنسی لطیفوں سے لے کر فیکس کی چوری کے قصے تک محفلوں میں بڑے تکبر سے سنائے۔

اس دعوت کے بعد مشہور و معروف گلوکار فقیر حسین کا گانا تھا۔ اس گانیک کی شہرت ملک اور بیرون ملک جنگل کی آگ بن کر پھیل رہی تھی۔ امریکہ، یورپ، انگلستان، وچ، شارجہ، دبئی کون سا ملک تھا جو اس نے اپنی آواز کے جادو سے فتح نہ کیا۔ غزل، نیم، ٹائیکس، گیت، ٹھمری، دادر، خیال سبھی قسم کی موسیقی پر حاوی تھا۔ اس کی مانگ کا یہ عالم تھا کہ اس سے تاریخ لینے کے لئے کئی کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ اس کا سودا کی سا مینجر اب تین لاکھ روپے فی فنکشن پہلے وصول کرنے لگا تھا۔ پھر فقیر حسین فنکشن کے دوران کسی کی فائنل قبول نہ کرتا۔ وہ اور اس کے سازندے بیوشہ فائو سٹار ہوٹل میں رہتے۔ فنکشن دینے والوں کو حکم ملتا کہ فقیر حسین کے لئے دیسی گھی میں کھانا پکوا جائے کیونکہ وہ اپنے طے کے معاملے میں بڑا محتاط تھا۔ اگر حاضرین ذرا بھی غیر سنجیدہ ہو کر بھگوانا لگتے یا دلی غلڑی آپس میں باتیں کرتی تو فقیر حسین فوراً اٹھ کر چلا جاتا۔ اس کی کچ اداویوں، شہین حراتوں پر لوگ اور ہلا ہلا کر کے اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کی نازک مزاجی کو فخر سے آپس میں بیان کرتے۔ امیر لوگوں کا خیال تھا کہ اس بات کے پیچھے بھاگنے میں کوئی عبات ہے نہ کمتری بلکہ انان کے بارے میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ وہ فن کے بے حد شہسلی ہیں اس لئے وہ یہ یہ معنی ٹھہرے کہ انہیں قلبی طور پر روپے پیسے کی ہرگز پروا نہیں۔

نجم اپنے دربار کی ناہی کے باعث کسی بھی فنکشن میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بلبل نے ساتھ وہ بات لیت شامیانے تلے پنچا، سارا پنڈال رنگ رنگ بیوں اور کپڑوں کی بی بی حضرات سے کچا بھج بھرا تھا۔ گو اس کی ناکامیوں کی داستانیں پھیل رہی تھیں، چاہے بھی اقلیم دولت نے اسے سردار کے لئے لوگوں نے راستہ چھوڑا اور وہ

وہ کچھ دیر ہنستا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ پھر وہ ملن بھری آواز میں بولا: ”اسی لئے میں آپ کو منع کرتا تھا کہ درس لینے نہ جایا کریں لیکن آپ کو اپنے وقت کا کوئی بہتر مصروف نہیں سوچا۔ اب آپ کی شخصیت ایسی ہو گئی ہے جیت کی، مادی نے دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو۔ آپ وہاں موجود تھیں جب ایلین اور اللہ کے درمیان امید پر ڈائیلاگ ہوا؟ پہلے آپ نے فلسفہ پڑھا، اب دینی رساں اور ان ہفتہ وار درسی لیکچروں نے آپ کا بیزا غرق کر دیا۔ پہلے میں بھی تکلیف کے وقت اللہ کو پکارا کرتا تھا لیکن اب نہیں۔۔۔ اب میں جانتا ہوں کہ میرے فیصلوں نے مجھے کامیاب بنایا اور میرے ہی فیصلوں نے مجھے ناکام کر دیا۔ اس میں کسی سپر نیچرل فیکٹر کو دخل نہیں۔ جو لوگ اولاد کے لئے اور اپنے لیے درست فیصلے کرتے ہیں، انہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ میں نے ضرور کہیں کوئی بڑی غلطی کی ہے۔۔۔ جس طرح کچھ احمق اچھی تعلیم دے بغیر اولاد کو معاشرے میں چھوڑ کر پیچھتاتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی میں نے کچھ کیا۔۔۔ کوئی غلط فیصلہ، کوئی ناکام پلاننگ۔۔۔“

”اگر آپ اس ناکام پینچیا چھوڑیں، تو شاید۔۔۔ باتیں نے کن مسیبتوں سے اپنے بیوں کو ڈاکٹر بنایا۔۔۔ چار سال سے بیکار بیٹے ہیں اسلم اور سلیم۔ بھئی تو مچ گیا لڑیں انسانی تجویز کے علاوہ کوئی اور فیکٹر بھی ہو سکتا ہے۔ لہیں انہیں انسانی تجویز اپنالیں لہیں ٹیل ہو جاتی ہے شاہد! سوچا کریں۔۔۔ فوراً لیا لیں۔“

”واہ جی واہ! یعنی تم اتنی احمق ہو کہ اپنے خدا کو اب بے انصاف بنانے پر تلی ہوئی ہو۔۔۔ یعنی تمہارے رب کو یہ بھی علم نہیں ہو تا کہ اتنی کڑی محنت کا کچھ اجر بھی ہونا چاہیے۔ ہم سرمایہ دار ہی تمہارے رب سے بہتر ہیں جو محض اس کے حکم کو سن کر پیسہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کرتے رہتے ہیں۔۔۔ پہلے حکم سن کر ایسے کرتے تھے، اب ہیومن رائیٹ سمجھ کر کرتے ہیں۔“

یہ باتیں سن کر ہیلہ خاموش ہو گئی۔ محاسن خیال آیا کہ وہی شاہد سے بحث کر کے یہ کفر کے گلے کھلوا رہی ہے۔ جی ہی تی میں معافیاں مانگتی وہ غسل خانے کی جانب چلی۔ آنسو جو اس کی آنکھوں سے نکلے، سک مرمر کے فرش پر پھٹے ڈالتے گئے لاکر دونوں کی خاموشی سے ایک عرصہ تک بند رہا۔



دونوں عین سامنے والے صوفوں پر جا بیچے۔ نجم رضوان نے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ پہلے دور میں ہلکی پہلکی موسیقی اور کافیاں.... پھر رات کا کھانا اور اس کے بعد کاسکی موسیقی کی محفل برپا ہوتی تھی۔

فقیر حسین کندھے پر پیشینے کی چادر بے پروائی سے اٹکائے تان پورے سروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ باقی سازندے بھی نظریں ملانے اور سروں کو تال میل میں لانے کی فکر میں تھے۔

معا فقیر حسین کی نظر جمیلہ پر پڑ گئی۔ دبلا پتلا، لمبا، سانولا فقیر حسین اپنی نشست سے کسی راہب کے وقار کا مجسمہ سا اٹھا۔ اس نے بڑے مودب انداز میں ہاتھ دھوئے، نظریں گرائیں اور بلند آواز میں کہا:۔۔۔۔۔ "اجازت ہے بی بی جی؟"

جمیلہ نے سر پر دوپٹہ اڑھ کر ہاتھ جو ابا جوڑے اور خوش ہو کر کہا: "بی اجازت ہے۔" کنسرٹ شروع ہو گیا۔۔۔۔۔ شاید نے آواز گرا کر جمیلہ سے پوچھا: "تم فقیر حسین کو جانتی ہو؟" جمیلہ نے کھسر پھسر میں کہا: "شاید اسے غلطی لگی ہے ورنہ اتنے بڑے فنکار کو جاننے کا میں تو دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

پنڈال میں تجسس اور سکیٹل کی ہوا چلنے لگی۔ اب خوش فکرے دولت مند بیلے اور شاہد سے از سر نو بات کرنے کے شوق میں کھسکے لگے۔ شاہد کی ناکامیاں اسے بارڈر لائن پر گھسیٹ لائی تھیں۔ وہ وقت دور نہیں تھا جب فیشن ایبل وی آئی پی طبقہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن ایک "اجازت ہے" نے تجسس کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ انٹرول تک لوگ مسٹر اینڈ مسز شاہد کے گرد گھیراؤں کر ان سے فقیر حسین دی گریٹ لیجنڈ کے بارے میں ذاتی معلومات اکٹھی کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ شاہد کے تیز دماغ نے بھی ایک خوبصورت کہانی گھڑ لی۔ وہ سب کو بتانے لگا: "بچپن سے سال جب میں کروم ویل اسپتال میں جزل جیک اپ کے لئے کیا تھا تو فقیر حسین بھی وہیں داخل تھے۔ ان دنوں فقیر حسین بڑے پریشان تھے۔۔۔۔۔ گلے کے سرطان کی وجہ سے۔۔۔۔۔ سارا سارا دن ہم بیٹھے تاش کھیلتے رہتے۔ انہیں میٹھی سپاریوں کا بہت شوق ہے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود یہ مجھ سے مانگ مانگ کر سپاریاں کھاتے تھے۔" اس کے بعد ایک جاندار قہقہہ اور نجم رضوان کے جنسی لطیفے۔۔۔۔۔ یکایک شاہد کے ہاتھ میں "پرومیٹیوس کی آگ" آ گئی۔ وہ اخباروں کے رنگ

دار صفوں سے حاصل کردہ انفریشن کو اپنے تخیل سے ملاقاتوں میں بدل رہا تھا۔ فقیر حسین اس وقت مائیکل جیکسن سے بھی زیادہ میڈیا کا پیارا تھا۔ اس کے انٹرویو، تصویریں، حالات زندگی قریباً سارے میڈیا پر چھائے ہوئے تھے۔ گولڈن ڈسک تو بن ہی چکی تھی، اب اس کی پلاٹینم ڈسک بننے کی تیاری تھی۔ گینیز بک آف انفریشن میں اس کا نام دنیا کے مشہور ترین سنگر کے طور پر چھپ چکا تھا۔ میڈونا اور مائیکل جیکسن اس کے ذاتی دوست تھے۔ فقیر حسین کو موسیقی کی دنیا میں "ماں سوک" کی طرح انجوبہ روزگار سمجھا جاتا تھا۔

وہ مشاہیروں کا مشاہیر.... اور گانگیوں کا گانگ تھا۔

ہفتہ وار مذہبی درسوں نے جمیلہ کی زندگی کی تودہ نہ لی تھی، البتہ سوچنے اور باتیں کرنے کی قوت آ گئی تھی۔ اپنی موسیقی میں گم، سروں کی اداسی میں سرگرداں فقیر حسین کو جمیلہ کبھی سنیچ پر دیکھتی اور عش عش کرتی، کبھی اس کی آنکھیں شامیانے کی چھت پر جا نکلتیں اور وہ سوچنے لگتی کہ واقعی وہ جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے، جسے چاہتا ہے دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ وہ نہ چاہے تو شہرت ملتی ہے نہ دولت.... اور جب وہ چاہے تو خود بخود سالان پیدا ہونے لگتے ہیں، خود ہی اسباب اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ ہی آپ توفیق مل جاتی ہے، مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ سب کچھ از خود چالو ہو جاتا ہے۔

شامیانے تلے بزنس کیونٹی اور شامیانے کے پیچھے خلاصی طبقہ، ڈرائیور، بیرے سارے فقیر حسین کے سحر میں آئے ہوئے تھے۔ استھائی ہو کر انترہ، بلمپت ہو کر درت اس کا ہر سُر اللہ کے فضل کی طرح اس پر تھا تھا۔ کہیں کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جو اسے ذاتی طور پر جاننے کی آرزو مند نہ تھی۔ یہ توجہ، آرزو مندی، خواہش ان امیر لوگوں کے پیسے سے ممکن نہ تھی....

جمیلہ بھی فقیر حسین سے ملنے کی خواہش مند تھی لیکن اس کی وجہ کچھ اور تھی.... شاہد اس رات اپنے ہم چشموں میں فقیر حسین کے ساتھ اپنی پرسنل ملاقاتوں کے بیان میں مشغول تھا۔ کروم ویل اسپتال کی اولین ملاقاتیں اور امریکہ کے قیام میں اس سحر ساز فنکار کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے اس کی مبالغہ آمیز گفتگو کا نچوڑ تھے۔

جمیلہ نے پورے تیس سال بعد فقیر حسین کو دیکھا تھا۔ اس دوران جمیلہ نے اس کے متعلق مضمون پڑھے، اس کی تصویریں دیکھیں، اس کے ٹی وی کے پروگرام ڈسکس

کئے، کیسٹ سنے لیکن اس نے کبھی کسی کو نہ بتایا کہ وہ فقیر حسین کو قریب سے جانتی ہے۔۔۔۔۔  
اس وقت سے جب اس کے ابا جی ریڈیو سٹیشن پر پروڈیو سر تھے اور بیس بائیس سال کا تپ  
دق زدہ فقیر حسین ان سے پروگرام مانگنے آیا کرتا تھا۔

ان دنوں جیلہ کے ابا جی کشمیری بابا کے مزار کے پچھواڑے ایک ٹنک سی ٹکلی میں  
رہتے تھے۔ گھر کی اوپر والی منزل میں لکڑی کے فریم ورک میں پلمنوں، کھڑکیوں سے ڈھکے  
شہ نشین تھے اور بڑے پھانک کے بغل میں چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے آنے جانے  
والے، خاص کر فقیر حسین جیسے سر جھکا کر صحن میں داخل ہوتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے پروڈیو سر میر شیر کاکشمیری گھرانا حسن کی کان تھا اور جیلہ ان  
خوبصورت لوگوں پر بھی مستزاد تھی۔ کشمیری چائے سی گلابی گلابی، نمکین نمکین، دراز قد،  
مغلیہ عمارتوں کی سی روشن، چنار کے درختوں کی طرح متناسب، اس کا ٹانگ الٹ سر نہیں تھا۔  
ڈل لیک میں چپو چلنے کی آواز اس کے گلے میں ٹنٹی تھی۔ جب وہ گنلاتی، سب چپ ہو  
جاتے۔ بے جی باورچی خانے کی باسی تھی۔ گولاش، کھٹے بیگن، آب دوش، بھارتی وہ رک  
کر جیلہ کا فلمی گانا سننے لگتی۔ دم بخود ہو کر بے تی سوچتی۔۔۔۔۔ جیلہ تو جاو کر رہی ہے، کہیں جو  
اس کی آواز کسی کے کان پر گئی تو قیامت آجائے گی۔

کشمیری لوگ سردیوں میں لمبا یزن بند کمروں میں گزارنے لے جاتی رہتے ہیں۔  
وہیں انہوں نے کشیدہ کاری، قالین بافی، اخروٹ کی لکڑی سے دل بسایا۔ وہیں اپنی تنہائی  
کے پیتل کو صبر کے ریگ مال سے چمکانا سیکھا۔ بے جی میں بھی اپنے پرکھوں کا لہو تھا۔ وہ  
خوب جانتی تھی کہ خواہش کے چڑھے پانیوں کے آگے بند باندھنے سے پانی چڑھ آتے ہیں۔  
تھوڑا بہت نکاس ہوتا رہے تو طوفان نہیں آتے۔ اسی لئے بے جی نے کبھی جیلہ کو گانے  
سے نہ روکا۔

ایک دن جیلہ کلچ سے لوٹی تو بڑی ناخوش تھی۔ وہ باورچی خانے کے دروازے  
میں چوکھٹ ہی پر رک گئی۔ بے جی اس وقت گوشت کوٹنے کے عمل میں تھی۔

”کیا ہوا جیلہ؟“

”کچھ بھی نہیں، بے جی۔“

”کچھ بھی۔۔۔۔۔ روٹی ہو؟“ بے جی کو اپنی اولاد سے بات کرنا برا مشکل لگتا تھا۔ ان

لوگوں کی جذباتی اعانت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

”اوہ بھائی پھر بھی بتا تو روٹی ہے تو؟“

”آپ لوگوں کو کیا! سارا دن ابا ریڈیو سٹیشن رہتے ہیں، شام کو دوستوں کے ساتھ  
شطرنج کھیلتے ہیں۔ آپ کو باورچی خانے نے قید کر رکھا ہے۔ میں کیا کروں؟“  
”تمہیں کیا کرنا ہے جیلہ؟“

”آج ہمارے کلچ میں نعت خوانی کا مقابلہ تھا، میں سینڈ آئی۔“ اس کی آواز تھرا  
گئی اور آنسو جھلا جھل آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے۔

”مبارک ہو، لو بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری آواز ہی ایسی ہے،  
سینڈ تو آتا ہی تھا۔ اللہ کا شکر کرو جیلہ۔۔۔۔۔“

جیلہ پھر گئی۔۔۔۔۔ ”جی نہیں، میں شکر و کر نہیں کر سکتی۔ مجھے تو فرسٹ آتا تھا۔ جو  
لڑکی فرسٹ آئی ہے اس کی آواز تو خاک بھی نہیں، ہاں۔ ماسٹر اسے موسیقی سکھانے آتا  
ہے۔۔۔۔۔ حج صاحبہ نے کہا کہ میری آواز کچی ہے۔۔۔۔۔ اگر میں تھوڑی سی ٹیوشن لے لوں تو  
کمال کر سکتی ہوں۔“

بے جی کے منہ کو تالا لگ گیا۔

بھلا میر شیر گانے کی ٹیوشن پر کیسے مانیں گے؟ ایسی روایتی محلہ داری، پھر کشمیری بابا  
کے سامنے بی کا عاقل۔۔۔۔۔ گھر میں کشمیری لوگوں کی روایات کا ایک پورا پیرین، زندگی جینے کی  
ایک پوری اساس!

”بے جی! ابا جی سے کہیں مجھے کسی استاد کی ٹیوشن لگوا دیں۔ ان کی پروڈیو سری  
کب کام آئے گی؟“

بے جی کو آگ لگ گئی۔۔۔۔۔ ”ہم تجھے کلچ اس لئے نہیں بھیجتے کہ تونٹ نئے مسائل  
لے کر آجایا کرے گھر۔۔۔۔۔ میں نے سو بار میر صاحب سے کہا اسے نعت خوانی کی اجازت نہ  
دیں۔ چھوٹی اجازت سے بڑا حوصلہ کھلتا ہے۔ پر وہ تو تیرے آگے بولتے ہی نہیں۔۔۔۔۔“

جیلہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی رہی۔

”اماں! بس تھوڑی دیر ٹیوشن لگوا دیں۔۔۔۔۔ میں زاہدہ کو ایک بار ہرادوں، پھر آپ  
بے شک خود ہی ٹیوشن بند کر دینا اپنی مرضی سے۔۔۔۔۔ مجھے کچھ سڑتل کا تو پتہ چلے، لے تو

پکڑنی آئے... اماں! جب آپ کو اعتراض ہو، خود ہی ٹیوشن بند کر دینا... جو میں بولوں تو آپ مجھے جوتے ماریں، شوق سے۔ پلیز بے جی، پروس۔“

اس وقت جمیلہ کے دماغ میں ایک ہی بھڑکھسی تھی اور وہ تھی زاہدہ کو بچاؤ کھانے کی۔ جس طرح ٹرائی اٹھائے غرور سے مسکراتی وہ جمیلہ کے پاس سے گزری تھی، اس لمحے نے اسے پچھاڑ دیا تھا۔

جمیلہ مل کلاس لڑکی کی طرح پنجابی میں پلیز اور پروس کہہ کر چپ ہو گئی لیکن اس کے اندر سے بذات خود ٹرائی اٹھانے کا خواب کبھی چپ نہ ہوا... میر شیر کے گھرانے کو زیادہ اصرار کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ خواہشوں کو دبائے، احتجاج کو دم پخت کرنے اور واضح کو غیر واضح کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی ساری خوشیاں کھانے پکانے، رینڈھے پروسنے کے حوالے سے ترتیب دی تھیں جہاں آگ پر چڑھنا اور ڈھکنے لگا کر پکتے رہنا بنیادی عمل تھا۔ ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر جو قومیں مرد اور عورت کے اختلاط میں آزادی نہیں برتتیں اور اس رشتے کو جو باہمی قلبی لگن سے پیدا ہوتا ہے مقدس فریضہ سمجھ کر اس کی پاسداری کرتی ہیں، ایسی قوموں کی جنسی خواہش راستہ بدل کر معدے میں گھس جاتی ہے۔ پھر فردا فردا اور من حیث القوم عام طور پر وہ شدت اور جذبات جو وہ جنس مخالف کے لئے محسوس کرتے ہیں کھانے کھانے میں ان سے خلاصی مل جاتی ہے اور یہی کھانا پینا ان لوگوں یا قوموں کے لئے شاستری بدھی سلن رسم و رواج کا ستون بن جاتا ہے۔ دسترخوان وسیع اور کھانے والے خوش خوراک ہو جاتے ہیں۔ یہ خوش خوراک جسم بھدے اور ست الوجود کر کے افراد کو بڑے کاموں کے لئے نااہل کر دیتی ہے۔ مذاہب میں سب سے زیادہ پابندی جنسی اختلاط پر ہونے کی وجہ سے لوگ جھوما جھومی سے اجتناب کرتے، لیکن صنعتی انقلاب نے صورت حال بدل دی۔ جب دھندے ان گنت ہوئے اور کرنے والوں کی مانگ بڑھی، مرد اور عورت کو ساتھ کام کرنے اور وقت گزارنے کی مجبوری نے دل اچاٹ کر دیئے تو مذہب کی طنائیں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔ لبرل اور غیر مذہبی ہوئے بغیر صنعتی ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ کھروں میں باہمی میل جول کم ہوتا آیا۔ فیکٹریوں، بسوں، سب دیر، ہوٹلوں میں ہر جگہ خلق آپس میں خلط ملط ہونے لگی۔ جنسی خواہش کا نکاس آسان ہو گیا۔ لیکن جو قومیں یا لوگ ابھی مذہب کے پابند تھے، انہوں نے

اس درد دیرینہ کو پیٹ میں چھپا لیا اور اس پیٹ پوجا کے سارے مجلسی بھی ہو گئے اور جنسی خواہش سے قدرے آزاد بھی!

میر شیر کے خاندان نے خواہشات کے نکاس کے لئے ایک بنیادی اصول بنایا تھا۔ یہ لوگ بڑی خواہش میں سے تھوڑی سی ہوا نکالنے کے قائل تھے۔ خواہش کا راستہ نہ بدلتے، بس اسی خواہش کو تھوڑا بہت بچھاؤ کا راستہ دے کر اس کی شدت کم کر دیتے... جس طرح ناز میں سے تھوڑی سی ہوا نکال دیں تو گاڑی اچھلتی، چھلانگیں لگاتی نہیں چلتی۔

”اباجی... پلیز میری ایک بات مان لیں... پروس، بس جس وقت آپ چاہیں گے بلکہ جب امی کی مرضی ہو وہ ٹیوشن بند کر دیں جی... پروس... پلیز۔“ رات کو جمیلہ باپ کے پاؤں دبا کر اٹھی تو ابھی تک زاہدہ ٹرائی اٹھائے اس کی نظروں کے سامنے تھی۔

”کیسی ٹیوشن؟“ میر صاحب نے شطرنج کے مہرے اٹھا کر پوچھا۔

جمیلہ نے نعت خوانی کا واقعہ پھر تفصیل سے بیان کیا اور آزر دگی سے بتایا کہ کیسے زاہدہ ٹرائی اٹھائے اس کی کرسی کو جان بوجھ کر ٹھڈا مار کر گزری تھی۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے... یہ بھی درست ہے کہ میں ریڈیو سٹیشن پر پروڈیو سر ہوں اور ٹیوشن کے لئے ماسٹر ڈھونڈنا مشکل نہیں... لیکن تم خود ہی خیال کرو... یہ دو قدم پر کس قسم کا بازار ہے... اور محلے والے کیسے جھلا ہیں!“

”اباجی جب میں کلج گئی تھی تب بھی آپ یوں ہی کہتے تھے۔ بتائیے کوئی طعنہ، لاہنا آپ کے کان سے گزرا... پروس، میں چھ مہینے میں اپنے سرتال ٹھیک کر لوں گی۔ مجھے ”لے“ پکڑنا آ جائے۔ مجھے پروفیشنل نہیں بننا اباجی... میں صرف نعت خوانی میں فرسٹ آنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک بار... پلیز... اباجی پروس... پلیز۔“

ابا، میر شیر بڑے لحاظ والے آدمی تھے۔ جمیلہ کے آگے جھکنے میں کچھ وقت لگا لیکن ناصبور بیٹی کے آگے آخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ریڈیو سٹیشن پر استاد مراد خان سے بات کی۔ استاد صاحب بڑھے پھونس، آنکھ سے دکھ نہ پاؤں میں چلنے کی سکت۔ پروگرام مانگنے عموماً میر شیر کے پاس آتے رہتے۔ پکا گانا ایک زمانے میں خوب گاتے تھے، اب نقلی دانتوں کی وجہ سے تن کے ساتھ سیٹیاں بھی بجاتی تھیں۔ تن پورہ بھی لرزتہ آواز بھی کانٹتی، سم پکڑنے میں بھی چوک جاتے۔ میر صاحب کا خیال تھا کہ استاد مراد خاں خود ٹیوشن کے لئے

آئیں گے لیکن استاد صاحب نے اپنے آٹھ بچوں میں سے سب سے چھوٹے بیٹے فقیر حسین کو میر صاحب کے گھر بھیج دیا۔

یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب غلطی ہونا ہو تو کسی نہ کسی طور پر ہو کر رہتی ہے۔ ایک دروازہ تھوڑا سا کھلتا ہے اور انسان دھڑام سے غلطیوں کی غلام گردش میں داخل ہو جاتا ہے۔ فقیر حسین سردیوں کی شام میں جھپٹنے کے وقت ایسے آیا کہ سر پر دوہرا کمر تھا۔ بے جی بغیر چٹھے کے آئیں، سمجھیں بڑھا استاد مراد خان ہے۔ دروازہ کھول کر رنگین شیشوں والی ٹچلی بیٹھک میں بٹھا دیا۔ جمیل سے یہ بھول ہوئی کہ وہ سمجھی اباجی نے فقیر حسین ہی کو بھیجا ہو گا اس لئے اس کا ذکر کسی سے کرنا بیکار ہے۔

فقیر حسین دوہرا کمر سر پر اوڑھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ تپ دق کا مریض، ایتھوپیا کا باشندہ، سبہ حد دہلا پتا، قیدی سا خوفزدہ، بمشکل تمام بائیس برس کا ہو گا۔ لمبے لمبے بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے لمبی ستواں ناک نے اس کے چہرے کا پروفائل اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کے لئے میر شبیر کی بیٹھک کسی محل سے کم نہ تھی۔ کین کے صوفے پر کپڑا چڑھا تھا، مینٹل پیس پر کالے کپڑے پر موتیوں سے کڑھی بٹخ بڑے جلال سے گھور رہی تھی۔ پیتل کے گلدان نفلی پھولوں سے لدے تھے۔ کمرے کی اکوڑتی دری باجبا سے مسک گئی تھی۔ فقیر حسین کے گھر کھانے کو بھسی تھا، بھسی نہ تھا لیکن اس کے باپ نے فقیر کو آدھے پونے سر لگانے کی مشق نہ کرائی تھی۔ استاد مراد خان سر کا سا گر تھا اس نے آخری عمر میں اپنے بیٹے کو امیر البحر بنا دیا تھا۔

”سلام علیکم سر۔۔۔“ جمیل نے اندر داخل ہو کر کہا۔

”وعلیکم سلام، بیٹھے بی بی۔۔۔“

باجبا مسکے ہوئی دری پر دونوں آئے سامنے بیٹھ گئے۔ جمیل کہیں سے ایک پرانا ہارمونیم لے آئی۔ پھٹ پھٹ ہوا دے کر جب فقیر حسین نے سرگم نکالی تو جمیل اپنے سارے حسن کے باوجود حقیر سی ہو گئی۔ سرگم میں اتنی موسیقی بند ہے، اس بات کا اسے علم نہ تھا۔ دو چار پلٹے فقیر حسین نے لیے تو جمیل کو اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ بھلا اس اعتماد کے ساتھ وہ کا سکتی ہے۔۔۔؟ نعت خوانی کی ٹرائی کچھ لمحوں کے لئے دھندلا گئی۔

میر شبیر صاحب پروڈیو سر ریڈیو پاکستان کو جب فقیر حسین کا علم ہوا تو اسے ٹیوشن

دیتے ہوئے پانچواں ہفتہ تھا۔ اس عرصے میں جمیل بسنت بہار گانے لگی تھی۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ میر صاحب بے جی پر گرے۔

”لیں آپ ہی نے تو اسے بھیجا تھا۔ میں کیا بتاتی؟“

”مولی گاجر کے بھاؤ تک بتا دیتی ہو، یہ ذکر کرنا ہی بھول گئیں کہ جوان جہان فقیر حسین گھر آتا ہے اور وہ بھی تان پورہ اٹھا کر! حد ہو گئی۔ کیا سوچتے ہوں گے محلے والے؟۔۔۔ بیٹی کو کیا بنانا ہے ہمیں؟“

”یہ تو اس وقت سوچنے کی بات تھی جب آپ نے اپنی لاڈلی ٹیوشن کی اجازت دی۔۔۔“

اب مشکل یہ آن پڑی کہ فقیر حسین کا کردار، پابندی وقت، تعلیم دینے کا منفرد سلیقہ، کوئی ایسی سقم والی بات نہ تھی کہ اچانک بیٹھے بٹھائے اس پر کوئی الزام لگا کر نکالا جا سکے۔ یہ بھی زندگی کا عجیب چلن ہے کہ جب کوئی شخص شدت سے کسی آرزو میں مبتلا ہو جائے تو متعدد بار خواہش پوری ہونے کے اسباب خود بخود پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جمیل کی خواہش بھی اسی شدت نے پوری کی۔

اس روز فقیر حسین شام کو دیر سے آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ بارش کچھ دیر پہلے رکی تھی اور سرکتی سسکتی ٹھنڈی ہوا سارے گھر میں فقط انجماد کو بکھیرتی پھر رہی تھی۔ فقیر حسین کھیں اوڑھے، تان پورہ اٹھائے دری پر آکر بیٹھ گیا۔ جمیل نے ہارمونیم پر ہاتھ چلا کر اوپر نظر کی تو فقیر حسین لرز لرز کر دانت کٹکانے کے عمل میں تھا۔ پھر وہ تان پورے سمیت کھیں تانے، بے ہوش، دری پر لڑھک گیا۔ جمیل نے اٹھانے کی کوشش کی لیکن فقیر حسین بے سدھ تھا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو نہ جانے کتنا تیز بخار تھا کہ جمیل گھبرا کر اندر گئی اور بے جی کو ساتھ لے کر ترنت آئی۔ دونوں نے تو تمہو کر کے فقیر حسین کو کین کے صوفے پر لٹایا۔ سر کے نیچے تکیہ دیا اور اوپر لحاف اوڑھالیا۔ فقیر حسین کی آنکھوں کی صرف سفیدی ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ رضائی کی گرمی پا کر بے ہوشی سے گہری نیند میں چلا گیا، لیکن دونوں ماں بیٹی ششدر دری پر کھڑی رہ گئیں۔ خاصی دیر چپ رہنے کے بعد بے جی کے اندر کا اباں مٹہ تک آ گیا۔ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ فقیر حسین جس کے لمبے بازو اور ٹانگیں صوفے میں سامنے رہے تھے، کچھ سننے کا اہل ہے۔۔۔ وہ ہلک کر بولیں:

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بے جی!“ جیلہ کے سر سے چھت اڑ گئی۔  
 ”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ابھی تو میر صاحب نے تجھے فقیر حسین کو درمی پر سے  
 اٹھاتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ دیکھ لیتے تو قیامت آجاتی.... فلمی شٹ لگتا تھا۔“  
 پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن جیلہ بھی کبھی کبھی لمبے سفر لمحوں میں طے کر لیتی۔  
 ”زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا بے جی! زیادہ سے زیادہ میں اُستاد جی سے شادی کر لوں  
 گی ناں.... ایسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، بڑا اعزاز ہو گا میرے لئے....“  
 زنانے سے ایک تھپڑ جیلہ کے منہ پر آیا۔ فقیر حسین یکبارگی صوفے سے ہاتھ  
 باندھ کر اٹھا۔ ”آپ انہیں کچھ نہ کہیں بے جی.... میں چلتا ہوں۔“

بے جی کا شاوہر بند ہونے میں نہ آ رہا تھا۔  
 ”جیلہ ہم نے تیری خواہش کا احترام کیا.... سارے اصول توڑ کر.... ہم نے تجھے یہ  
 آزادی نہیں دی تھی کہ اس بے عزت کنکھے کو ہمارے منہ کی کالک بنا دے....“  
 ”آپ ہی تو کہا کرتی ہیں عزت اور دولت خدا دیتا ہے.... وہ کسی کی سفارش سے  
 تھوڑی دیتا ہے، ان کو بھی دے گا بے جی....“  
 ”آج تک تو نے کبھی میرے سامنے منہ نہیں کھولا جیلہ اور آج اس بھک منگے  
 مراثنی کی خاطر میرے منہ آ رہی ہے۔ لعنت ہو تجھ پر....“  
 فقیر حسین اور جیلہ دونوں چپ ہو گئے۔ پھر فقیر حسین نے رضائی کو پرے ہٹایا،  
 تن پورہ اٹھایا اور لڑکھڑاتے قدم باہر کی جانب اٹھاتا ہوا بولا: ”بے جی رضائی دھلوا لیجئے  
 گا....“

”ٹھہرو.... ٹیوشن کا حساب کر کے جاؤ....“  
 ”ریڈیو سٹیشن پر لے لیں گے جی۔ اچھا جی خدا حافظ۔“  
 فقیر حسین کانپتا لرزتہ پسینے میں بھیگا، کھیس میں تنبو سا بنا دروازہ کھول کر باہر نکل  
 گیا۔

جیلہ کو فقیر حسین سے محبت نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساری زندگی تو کیا ایک دن  
 گزارنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔  
 جیلہ خوابوں والی لڑکی بھی نہ تھی۔ لیکن اس وقت فقیر حسین کی بے چارگی نے

”لے جیلہ، تیری ضد نے تو میری ناک کٹا دی۔ اب جو میر صاحب ریڈیو سٹیشن  
 سے آگئے تو میری تو شامت آجائے گی۔ مجھے تو اس کے گھر کا بھی پتہ نہیں ورنہ ٹیکسی پر  
 ہی چھوڑ آتی!“

”کیوں، شامت کیوں آئے گی بے جی؟“ جیلہ نے ان بھول پوچھ لیا۔  
 ”ایک اجنبی نامحرم.... اور ہم دونوں اکیلی ہیں.... اس حال میں۔“  
 جیلہ نئی تعلیم سے آراستہ تھی اور بے جی جتنی ڈرپوک بھی نہ تھی۔  
 ”بے جی! اُستاد جی کو تیز بخار ہے۔ ابھی ہوش میں آگئے تو گھر چلے جائیں گے۔  
 اس قدر آنکھیں پھاڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

بے جی طیش میں آ گئیں۔ ”چلے جائیں گے.... آگئے تھے.... یہ تو کیسے بول رہی  
 ہے جیلہ.... معمولی میراثیوں کا لڑکا اور تو اس کی اتنی عزت کر رہی ہے، کیوں؟“ تیرے ابا  
 جی سن لیں تو میری چڑی اُڑھڑ دیں گے۔“

نہ جانے کیوں جیلہ کی آواز اُچی ہو گئی۔ ”بے جی! یہ میرے اُستاد ہیں۔ نیچر ہیں  
 میرے.... میں ان کی عزت نہ کروں؟ پھر ان کا علم مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔“  
 اب ماں بٹی بھگڑے کی حدود میں داخل ہو گئیں اور انہیں بھول لیا کہ فقیر حسین  
 کہیں سنتا ہی ہو۔

”میں بچکے دنوں سے یہ دیکھ رہی ہوں جیلہ! تیرے تیور بدل گئے ہیں۔ جو بات  
 بٹی کے دل میں ہوتی ہے، ماں کے نائنوں میں ہوتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی ان پڑھ جاہل نہ  
 سمجھنا۔ جو کچھ سات پردوں میں چھپ کر تو سوچتی ہے، مجھے سب معلوم ہوتا ہے۔“ ماں  
 گرجی۔

”لیں، میں نے کیا سوچا ہے کبھی.... کیا کیا ہے میں نے کہ آپ پھر رہی ہیں؟“  
 جیلہ معترض ہوئی۔

ماں غصے میں چند ٹانے چپ رہی، پھر گردن اکڑا کر بولی: ”ضروری ہے کہ کچھ  
 کرے تو پتہ چلے۔ تیرا رویہ ہی ایسا ہے جیسے مری جا رہی ہے.... اب اُستاد جی کے لئے  
 کشمیری چائے بن رہی ہے، اب مٹھائی جا رہی ہے، اب گلاس مانٹھا جا رہا ہے، اُستاد جی کا گلا  
 نہ خراب ہو جائے۔ بھئی خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، مانتے سبھی ہیں۔“

اس کے دل پر بڑا گمراہ فم چھوڑا۔ اس نے اپنے ہوش میں کبھی بے جی سے ایک سخت جملہ بھی نہ سنا تھا۔ اب نوبت جھڑپ تک آ گئی۔ اس کا جی جان سے جیلہ کو ملال تھا۔ اس رات وہ دیر تک جائے نماز پر بیٹھ کر روتی رہی۔ اسے فقیر حسین کو حاصل کرنے کا شوق تھا نہ وہ بے جی پر اپنی معصومیت ثابت کرنا چاہتی تھی۔ بس رہ کر اس کے دل سے ایک ہی صدا نکل رہی تھی: ”یا میرے مولا! جیسی بے عزتی سے تو نے اُستاد جی کو نکالا، ایسے ہی بڑی عزت سے انہیں یہاں لانا۔ عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے میرے مولا۔ مجھے یہ دن دکھانا ضرور۔ میرے آقا! میرے گھر والوں، دنیا والوں کو یہ ضرور بتانا کہ عزت اور رزق تو ہی دیتا ہے، اس پر کسی کا اجارہ نہیں۔“

شاید یہ گھڑی قبولیت کی تھی۔ شاید اس کے آنسوؤں نے ساتویں آسمان میں بلند و کر کے بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسی لمحے جیلہ کی معصومیت نے اوپر والوں سے پروسری نوٹ لکھوایا جس کی عندالغلب تاریخ کا خانہ خالی تھا۔

فادرن سوئٹوں میں ملبوس، ناگ پھن ٹائیاں لہراتے، آرام دہ اطالوی جوتوں میں ڈٹے، تمباکو اور خوشبوؤں میں بے برنس ٹائی کون، شاک ایکسیچنگ کاٹھ موڑنے والے، بیرون ملک فانیو سٹار ہوٹلوں میں چھٹیاں گزارنے والے، بچوں کے سکول، تازہ سکیٹل اور غیر ملکی سیاحتوں کو گفتگو کا حصہ بناتی ہوئی خوش باش گروڈ عورتیں۔۔۔ کھانے کی چیزوں کے ارد گرد براؤن، برونز اور گولڈ کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس حیثیت پرست، خود پسند اور خود آگاہ دولت مندوں کی نگری میں پوشینے کی چادر کو اپنے نیچے کندھوں کے گرد لپیٹتا ایک جادوگر آگیا تھا۔

اس کے پاس شہرت کی بانسری تھی۔۔۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھا اور اس کی ایکٹائی کو دولت کی باڑھ توڑ نہ سکتی تھی۔ فقیر حسین نے دھڑی دھڑی کر کے سارے شہر کو لوٹ لیا۔ مرد حضرات پھر بھی کچھ دھانے لیکن عورتیں تو اس دھڑی کے گرد گولی رنگ اکٹھی ہو گئیں۔ نیوز رپورٹر کی طرح ہر عورت اپنے لئے ایک الگ کہانی خارج داخل کرنے کی فکر میں تھی۔ کچھ بے پرکی افواہیں، کچھ رسالوں سے اخذ کی ہوئی خبریں، انٹرویوز، فضا میں پھیلے تھے۔ جیلہ ان پری و ش خواتین میں راہ بناتی فقیر حسین تک پہنچی۔

اس کے آنے پر فقیر حسین نے نگاہیں نیچی کر لیں اور ہاتھ پرارتھنا کے انداز میں جوڑ لے۔

”بی بی کیسی ہیں آپ؟“  
کچھ ابرو تھیر، کچھ تجسس میں اٹھ گئے۔۔۔ آرٹ سے محبت کرنے والی خواتین کے لئے یہ ایک نیا سکیٹل تھا۔

”اچھی ہیں آپ؟۔۔۔“

”جی۔۔۔“

”اور بے جی۔۔۔؟“

جب سے میر شیر حسین فوت ہوئے، بے جی فالج سے پڑی تھیں۔ جیلہ کو میکے گھر جانے کی فرصت کم کم ملی۔ بے جی کے لئے ایک بڑھیا نوکرانی رکھ دی تھی جس کی تنخواہ اور اخراجات جیلہ باقاعدگی سے ادا کرتی۔۔۔ لیکن اس کی زندگی کا ڈھچھری کچھ ایسا تھا کہ کشمیری بابا کے محلے کی طرف جانے کا اتفاق کم ہوتا۔ جیلہ بے جی کا نام سن کر گرم صم ہو گئی۔

”اور بے جی؟۔۔۔“

”وہ بھی ٹھیک ہیں جی۔۔۔ آپ کو یاد کرتی ہیں۔“ پتہ نہیں جیلہ کے منہ سے کیوں

نکلا؟

”میں حاضری دینے آؤں گا جی۔۔۔ آپ کی طرف۔ اور میر صاحب؟“

”ابا جی تو۔۔۔ فوت ہو گئے۔۔۔“

دونوں نے تھوڑی دیر خاموشی سے سر ہکا لیا۔۔۔ جیسے کسی بڑے آدمی کا ریفرنس

ہو۔

سنا ہے شہرت اور دولت میں ایک صفت میلہ گھومنی کی بھی ہے۔ یہ پھوار کی طرح پڑتی ہیں، شہنم کی طرح اڑ جاتی ہیں اور چھو چھپ غائب ہو جاتی ہیں۔ جب ستارہ پیشانی فقیر حسین نے سارے لوگوں کے سامنے جیلہ کے آگے عاجزی دکھائی تو پتہ نہیں کیسے شہرت اور دولت کی روشنی ہوئی آبشار کے چھینے شاہد پر بھی آ پڑے۔ اس بھولے برے جوڑے کا کھیم ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ کچھ نے سکیٹل کی زبان میں کھس پھسکی۔ کچھ نے دست بدست تجسس کی تھالی پھرائی۔ کچھ نے آپس میں سوچا کہ شاہد کو ازسرنو

راستہ دکھانے کی ضرورت ہے۔۔۔ سنا ہے دینے والا بڑی حکمت سے دیتا ہے۔ جو نئی شاہد کا مردہ ذکر زندہ ہوا، اس کے دن پھرنے لگے۔۔۔ بد نصیبی کے ہاتھی کو نکلر لگتے ہی موت آ گئی۔ شاہد کا حسن بصیرت، سکیمیں، حسن انتظام، تدبیر سب کو نکلنے سو نکلایا گیا۔۔۔ ہولے ہولے شاہد اپنی تجویزوں کا قائل، اپنی ذات پر بھروسہ کئے پہلے سے زیادہ خوش فہمی اور تکبر سے شہر کے وی آئی پی طبقے میں شامل ہو گیا۔ اسے لمحے بھر کو بھی گمان نہ گزرا کہ شاید اس میں مشیت کا بھی کوئی ہاتھ ہے۔۔۔ اور رضائے الہی بڑی ادا اور حکمت سے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

لیکن یہ اور بات ہے کہ جس روز فقیر حسین بے جی کے پاس پہنچا، ان کا جنازہ گلی سے نکل رہا تھا۔ جمیلہ کو ایک ہی رنج تھا کہ بے جی نے فقیر حسین کی شان و شوکت کیوں نہ دیکھی۔ پتہ نہیں چھوٹے فرشتوں نے معاملہ غلط کیا کہ دعا کا پروا نہ ہوئی۔ بے وقت تھا۔۔۔ پتہ نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے تحت بے جی کو اپنے کئے کی سزا نہ ملی۔۔۔ تکبر میں سنا ہوا، شیعوں کی آتش بازیاں چھوڑنا شاہد پھر اپنی دولت اور شہرت پر بحال ہو گیا۔

یہاں تک تو وہ سمجھ پائی تھی کہ عزت اور شہرت اللہ کے اذن سے ملتی ہے لیکن یہ بات ابھی اس کے دماغ میں نہ آئی تھی کہ کبھی کبھی بے قصور کو سزا ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی بھاری غلطیاں کرنے والے ہری سنگھ نموہ جیسے لوگ بچ جاتے ہیں۔ شاید وہ روز حساب کے فلسفے پر پورا ایمان نہ رکھتی تھی اور اس کی اہمیت نہ جانتی تھی، ورنہ وہ شاہد اور بے جی دونوں کو معاف کر دیتی!

اسی لئے تو کبھی کبھی جب اسے ہجرت زدہ بچے بہت یاد آتے، اپنی بے مقصدیت اور بے معنویت سمجھ نہ آتی تو سنگ مرمر کے فرش پر جا بجا اس کے آنسو چھیننے بن کر گرتے جنہیں دیکھ کر شاہد کو غصہ آ جاتا اور وہ اُونچی آواز میں تکبر سے کہتا۔۔۔ ”پتہ نہیں یہ گھر کب منظم ہو گا۔ پانی کے چھینٹوں سے فرش کی خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ نہ سیکھا جمیلہ۔۔۔ نہ پلاننگ، نہ وقت کا استعمال، نہ بندوبست، نہ تجویز۔۔۔ مجھ سے دیکھو جمیلہ۔۔۔ مجھے مانو۔۔۔“

## منسراج کا بین

سُرت میں لاویں تو وہ سال بڑا مینہ برس رہا۔ سکل وخت بارش ”ترم تو ترم تو“ اُترے۔ شام سے گھٹنا اندھیرا ہو جاوے۔ اوہ کالے بادل بھیتر باہر ایک کر دیں۔ پھر رات بھر بارش دیر ڈرائے دھمکائے۔ رینی رات بھر بولے۔ بارش کئی بوند نہ گرے۔ سمندر اُتر آوے لہراں سمیت۔

دھیان میں لاویں تو اسی سال میں ہو زنت راند ہوئے رہی۔ سارے پھل پھول پتر جھڑ گئے۔ اندر سے چھیلی چھک نکل آئی۔ اسے دیکھ تو بیٹے کا گم بھی من سے بھاگا پھرے۔ زنت پٹی پر ماتھا پھوڑ پھوڑا لولہاں روتی رہے۔ پھر چادر تان لیٹ جاوے۔ چاروں بچے رنگ رنگ کر کبھی ادھر سے چادر کھینچیں کبھی اُدھر سے، پر وہ موہ کی تاپ میں جلتی لڑاتی اپنے گھور اندھیرے میں بھٹکتی رہوے۔ جو میں اس کے ڈکھ کو ہلکا کہوں تو رب سے باز نہ آئے، جو بھاری کہوں تو جھوٹ لگے۔۔۔ ہمارا اکیلا جہد جب گھر سے چارپائی پر نکلا تو پوری دھرتی پیروں سے نکل لے گیا آسمان سمیت۔

بچوں تو اسی سال میرے بیرن کے جڑواں بچے ہوئے۔ ایک بچہ بھائی پاس رہا پر مرایا۔ میری ماں نے اپنی گود ڈالا کبھی ایک تاپ بھی اسے نہ چڑھا۔ میرے بھائی کی گھر دلی لٹنی ہو لڑا باندھ رہی۔ دوسرا بچہ اس کا ہو کر نہ پلا۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ سچ ہووے

پانی بھرن پنہاریاں رنگا رنگ گھرے  
بھرا اس کا جاننے جس کا توڑ چڑھے

ایسے بھگے دن۔۔۔ سورج بادل کا کھیل۔ جیون ابھی کھانڈے کی دھار نہ بنا ہووے۔

لہ منسراج (من۔ سراج) جمالیہ کا پالتو ہرن

سانولا رنگ، سفید بھنوس، ٹوٹے گرے دانت، آنسو گرے تو کھ اور ٹوٹ پھوٹ جاوے۔ میری رائڈ ہونے ترنت کھدڑ کی چدر میں موتی سمیٹے اور اپنی آنکھوں کو لگا لئے۔ اکھر راجپوت بولے گیا۔ ”زنت بی بی ہم میو لوگ.... کرنال بستی سے اٹھ کر ایدھر آئے۔ سیخ پورہ کی دھرتی کو دیر سے لگایا.... ہم میو لوکاں کا کیا کام پڑھنے لکھنے سے، پر نئی دھرتی کی ریت دیکھ کر پڑھے.... سکول گئے، ماشروں کی مار کھائی۔ آٹھ جماعتیں پاس کی۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں چراسی لگے رہے۔ دورے پر صاحب جاوے تو بھیرا ساتھ.... کوٹھی سدھارے تو بھیرا ساتھ۔ پر تیرے گھر والا سکول چھوڑ بھاگ گیا.... میں دل میں کھوب جانا یہ میو جاتی کا پرکھ ہووے، مانے پر مانے ناں.... چھوڑ دیا.... بس محنت مزدوری کو جانگا۔ کیا دیا گارے چونے کے ٹھلے نے؟ پاڑ سے گرا.... اودھر آگیا دفن ہونے کو ہمارے پاس.... لے میں کوئی روتا ہوں.... اکیلا تھا میرا جاہد۔ کوئی نیر بہا میری آنکھوں سے؟ کوئی جبر جستی کی میں نے اپنے مالک سنگ؟“

مینے کے تیز تیز چھینٹے بھیرے کے نینوں سے گرے۔ میری رائڈ ہونے اپنے سالو سے ترنت اس کی آنکھیں پونچھیں۔ اٹھ کر پانی کا گلاس لائی۔ سرے کے منہ سے چھوایا۔ بڈھے سے پیانہ جائے۔ ہو کبھی ہاتھ جوڑے کبھی پاؤں پکڑے۔ آخر کو دونوں اک دو بے کو چپ کرا کر پرانیاں باتاں کرنے چل پڑے۔ وہ کھاٹ پر بچہ گود میں لے کر بیٹھا۔ زنت چوکی گھیت بیٹھ کر پیر دبانے لگی۔

یوں ہی جب جاہد کو میں سمجھا بھاسکول بھیجا کروں ناں تب جاہد جانا نہ چاہے سکول میں۔ بولے اوکھے اوکھے سوال دیا کرتے ماشروں میں کسوں ”تو نکال تو سہی، دیکھ تیرا ابا آنکھوں کر گیا ناں۔“ پر جاہد تو سلیٹ پر پھر لکھے پھر مٹاوے.... لکھے پر پھر مٹاوے۔ میں پوچھوں ”کیا ہوا رے، کیوں لکھ لکھ کر مٹائے جات، کچھ جم کر کام کر!“.... جاہد اٹکھاں بھر کر بولے ”میا طریقہ تو ٹھیک ہووے پر جباب ٹھیک نہ آوے۔ سوچوں رقم ہی بھٹ لکھی رہی نا تب۔“

ایسے ہی میرے من میں رات گئے بھٹ جباب آویں۔ سوچوں، دھیان میں لاؤں۔ کئی رقیں جوڑوں۔ اے پالن ہار! ساری عمر بھیرے سنگ کٹ گئی، پر اب کیسے جباب بھٹ لگاؤ؟ سوچوں تو کوئی رقم ہی بھٹ لکھی گئی۔ طریقہ تو میرا بھی ٹھیک ہووے۔ اب میرے

بڈھے بھیرے کی پنسن سے روکھی سوکھی چلا کرے۔ ایک دن مسجد سے واپسی پر سرے نے چوکھٹ میں کھڑے چادر تانی ہو کئے دیکھا۔ اپنا جوان بیٹا اچانک ہمیں میں گڑ گیا، پر اس کو ہو کی چوٹ جیادہ لگی۔ نہر کنارے اونچے پلاڑے کی تیسری منزل پر کانڈی ٹھل اٹھائے جاہد کا پاؤں رہا۔ پاڑ سے گرا۔ تین پر ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا پھر مکتی ہو گئی۔ اب متھا پھوڑنی ہو نہ بولے نہ چالے، بس چادر تانے لانی منجی پر مردہ پڑی رہے.... آتے جاتے بھیرے کو یہی درشن۔

ایک دن بڈھے بھیرے نے کھنکار کر چادر اتاری مجھے للکاری آواج دی.... ”دیکھ ری جو بیدہ اسے تو دندل پڑی ہے۔ کس سے ڈھونڈ ڈھانڈ پرانا کھونٹرا لا کر سو لگھا، ہو ہوش میں آوے.... اپنے“

بڈھے سرے نے گھٹنے پر سر رکھا۔ پوری بیتی تالے بند۔ میں جو تاسو لگھایا۔ پل بھر گزرا آنکھ کھولی۔ بھیرے نے کٹوری میں عرق گلاب ڈال کر پالیا۔ میں پاؤں کی تلیاں جھیس، ہاتھ بازوٹے۔ زنت بدھی میں آئی۔ ٹیٹھی ماں کو دیکھ کر بچے رینگتے کھٹکے آ گئے۔ کوئی گود کوئی کندھے چڑھا۔ سرے کو پاس جان کر کپڑوں کی سرت آئی۔ سر کی چدر ٹھیک کی۔ نچرس گالوں سے جوڑ لیں۔ سوگ کی ماری دندہ لڑیا نچر آنے لگی۔

اب بھیرے نے مت دینا شروع کیا.... ”دیکھ جاہد کی بی بی! تجھ کو تیرے سنجوگ کا پھل مل گیا۔ تیرے آگے چار کھیلتے ہیں۔ اودھر ہم دونوں کئے دیکھ.... ایک ہی بیٹا نہ آگے نہ پیچھے۔ ساری عمر کی کمائی اپنے ہاتھوں ہمیں میں دبا دی.... اس کی اچھیا اس کے کام۔ کوئی پوچھے بھیرے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سنگ پنسن پائی؟.... ہاں جی پائی! تو میو جاتی کا ان پڑھ، اودھر آ کر تعلیم ہاتھ آئی؟.... ہاں جی آئی! ساری عمر کالی حندو قومی اٹھائے کر صاحب کے سنگ سنگ کوٹھی گیا۔ پھر رہے چوٹیں گھٹنے۔ کتابھی نہ بھٹکے اودھر کوٹھی کے سامنے۔ پر اودھر کے سپاہی لوگ بھیرے کو دیکھ دروجہ کھول دیتے رہیں.... کوئی پوچھے اجت پائی بھیرے؟ ہاں جی بہت پائی!.... پر کس بھاؤ زنت بی بی.... چاروں کھونٹ نچر چلا.... کیا ملا تیرے سرے کو.... اپنے ہاتھ دروجہ کھول کر قبرستان لے گیا سارا مال.... کھد ڈالا ہمیں تلے.... اور تجھے کیا پتہ زنت بی بی.... کیا ہوا میرے ساتھ۔ چپ کر جا۔ نہ رو۔ تیرے آگے تو چار کھیلیں ہیں....“

اب بھیرے کے بھی آنسو بہے۔ کھ پر لمبی لمبی جھریاں، سوکھے ہاتھ پیر، گھروا گھرا



مٹائے تو گھڑی رقم مٹے ناں۔ وہی جب چاہے تو مٹاوے۔ آدمی کے اپنے کئے تو کوئی پائے ناں۔ وہی رب سچا جو ہیدہ کی رقم مٹائے تو مٹے۔

لو پر سوچ کا بھی کچھ ٹھیک ناں۔ راہر سوچوں اُدھر بھول جاؤں۔ جو بھول جاؤں تو پھر سوچوں۔ عمر ناپی عورت کو ہر گھڑی سوچ بچار۔ سب موسم ملے بیٹھے۔ ہر گھڑی نویں بھی پرانی بھی۔

سائیں سے سب ہوت ہے بندے سے کچھ ناہیں

رائی سے پریت کرے، پریت رائی ماہیں۔!

روتی کر لاتی تاؤ کئے جب میں بچنی تو اس کی سمجھ میں کچھ آوے کچھ ناں آوے۔ میں بھی کیا بتاواں؟ بتانے کو کچھ ہووے تو مٹد کھولاں۔ مٹد کھولاں تو آنکھوں کی ندی چڑھ آوے۔ نیر نیر ندی نالا ملے تو دریا بنے۔ ندی ندی جڑتی جائے تو گھم گھیر دریا ہو۔ دریاؤں کے جل مل جل کر سمندر بناویں۔ اب آنسو آنسو کی کتھا تاؤ کو کیا بتاویں؟ اتنا برا گم کا پوکھر کیسے بنا جس ماں ڈوب جانے کو من چاہے۔ اس کی کتھا تاؤ کو کیسے بتاویں؟۔۔۔ نیر تو جب ہمیں، بے کار ہمیں۔

بس تاؤ جمیل سمجھائے رہا۔ ”دیکھ تاؤلی! سارا تو تیرا سر سفید ہوا۔ مٹد میں دانت کہیں ہووے رہا کہیں ناں۔ آواج تیری سننے کو اپنے کان کو ہتھیلی کی پیالی بنا کر لوگ سنیں۔ کھوہ میں گری نکرری کا پتہ لیویں۔ پیرایا کھور دل بھلی مانس تجھ سے تو بھرا بھلا۔ سو بچوں کے سر پر ہاتھ دھرے سے جائے۔ اپنی پیڑ بھول۔۔۔ پرایا گم ہو کا سے۔ کھور جالم یہ عمر کوئی اپنے لئے جینے کی ہووے؟ ایسا پتھر کر دیا تجھ کو جلد کی موت نے۔ کسی دوجے کا ڈکھ تیں کو نجر نہ آوے پل بھر کو۔ اتنے برس جب تیں لاہور گبار لئے تب اب کا ہے منسراج کی لاٹ تلے آ بیٹھی۔۔۔ اور سے پالن ہار کچھ اثر نہ گھیرے اس بڑھیا کے من ماں۔۔۔ تو ہی کچھ سمجھا اس کھور کئے۔“

اب تاؤ کے سامنے کیا سینہ بیٹوں۔ کیسے بتاواں تاؤ کو سارا راج پاٹھ چھن گیا؟ ٹوٹی کھاٹ، نہ بان نہ بستر۔ کوئی دن کو ٹھہر جا تاؤ چولے کا بالن بن جاؤں، کیا بتاواں تاؤ کئے؟ چولے چولے پر زنت بی بی کا قہجہ ہوا۔ بڑھے بیرے کو نہ میرے مرنے کی پھر نہ جینے کی۔ آگے جب میں چولے آگے سے گھٹنا پکڑ کر اٹھوں تو بیرا اپنا ناڑیوں بھرا سوکھا ہاتھ

بڑھاوے۔ اپنا جور لگا کر کھڑا کر دے۔ اب بیٹھ موڑ زنت کے بچوں کو آواجاں مارن لگ جاوے۔ تاؤ تیرے سنگ کیا بتاواں۔ کدھر سے سروغ کراں۔ اور جو بتاواں تو تاؤ سمجھے کیا؟ میرے اماں باوا تو پاکستان ہی نہ پہنچ لئے۔ راہ میں ہی گل کٹیں نے ڈھیر کر دیئے۔ ماں کی کھون بھری چدر سر پر اوڑھے میں باڈر پہنچی۔۔۔ ساری عمر لبور میں گجر گئی بیرے سنگ۔ اب سر پر چدر ہی نہ رہی۔ تاؤ کو کیا بتاواں کیوں آئی رہی میں من سراج کی لاٹ تلے۔ میرا تو سارا مال ہی تمہیں نے کھالیا۔ اب تو پالن ہار کو آواج نہ دے سکوں، تاؤ کی رہی دوسری بات۔۔۔ وہ تو ہو لیا بیرا ساتھ۔۔۔ بڑھاوا دیوے تو بیرے کوں۔۔۔ میری بات کب سمجھے؟ میرا تو سارا مال ہی لاہور کی تمہیں نے کھالیا۔ میں کوئی خوشی سے تو نہ آ رہی من سراج کی لاٹ تلے!

لیسے بتاواں یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ چھوٹی باتاں سے بڑی باتاں جنم لیں۔ زنت کا سب سے چھوٹا گلزارو رو رو ہلان، منی کے دانت نکلتے ہوئیں، وہ جدا اُوکھی۔ بڑے کاکے کے آنکھ دیکھنے آئی رہی۔ چاروں بھیس بھیس کر کے روئیں تو لگے گھر کا تختہ اٹ گیا۔ چاروں کو گھیر لھار، سٹی کالا لچ دے دلا میں گلی میں نکلی۔ ایک ڈھاک پر، ایک اُنکلی لگی، دو روں روں کرتے ساتھ چلے۔ بھکانے والا سائیکل پر ہووے۔ اس کے کئے پلاسٹک کی غلیلیں، چھوٹی چھوٹی قینچیاں، بھکانے، پلاسٹک کی پستولیں، پٹاکے، بچوں کو پکڑنے لئے انت کا سامان ہوا کرے۔ وہ تو فرسے آگے نکل گیا۔ میں آواجاں مارتی رہ گئی۔ میرے گھٹنے سے شتابی چلا نہ جائے۔ رونے بچوں کا ساتھ۔ کھسکاتی کھسکاتی، دوڑتی رکتی سائیکل والے کے مگرے مگرے گئی۔ پر وہ تو سائیکل پر ہووے۔ گلی کی ٹکڑ پر جائے کے دیکھاں تو وہ دن وانا، شادا، موڈ کاٹ اُونچے اُونچے آواز لگاتا پکی سڑک پر ہو لیا۔ بچے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگے۔ بڑے نے تو بابا بابا کہہ کر بلکنا شروع کر دیا۔ میں کو چپ کرانا مسل۔ جھوٹے وعدے، اٹکیاں پھکیاں باتاں میں لگا گھر مڑی۔ گلی سے تین سیڑھیاں اُونچا ہمارا دو کمروں کا گھر ہوا کرے۔ ہرا درو ہوا دھ کھلا چھوڑ گئی۔ وہ ٹوٹے دانت سان پڑا جھانکے۔ آنگن میں پاؤں دھرا تو بیرا کی آواج آئی۔ وہ آلااول گائے رہا۔ جوانی میں بیرے کی آواج سن کر من میں خواب جاگیں۔

لو پھر یہ بات بھی بتانے رہوں۔ بیرے کے کھاندان سنگ میرے تاؤ کا کوئی

سمندھ ناں۔ تاؤ ہمارا لڑکوں کی کھوج میں پھرے۔ پھر کسی نے ٹوہ دی۔ لڑکا جوان گھروے سانولے رنگ کا، آٹھوں پڑھا لکھا لاہور کے ڈپٹی کمشنر کا چہرہ لگا ہووے۔ تاؤ کی اپنی تین ٹانڈے جیسی دھیاں، اوپر سے میں چوتھی مالک نے لادی۔ تاؤ میرا پالن ہار کے کاموں پر زبھر۔ نہ کبھی رویا نہ گلہ سکایت کی۔ بیرے کو بلایا تیخو پورے ماں۔ تاؤ کا کھاندان اس سے منسراج کی لاث کے پچھوڑے کچی پکی بستی کی شکل میں رہت بنائی رہے۔

بیرا آیا۔

یہ لمبا قد، سر پر راجپوتی صاف، لمبے بازو والی گھیرواں قتیض، کانوں میں گول گول سنہری بالیاں، کلائی پر گھڑی۔ چلے تو مور تھر کے، بیٹھے تو راجہ لگے۔ تاؤ بولا..... ”لے جو بیدہ بارش آئی کھڑی، بھادوں کا بادل جانے کتنی دیر ہے..... تو شتابی پوڑے بنالے، دیر نہ کریو۔ گھنا بادل ہووے، بیرے کے صاحب نے لمبی چھٹی نہ دی، گھڑی کو لوٹے گا۔ جلدی پوڑے بناوے۔“

میں تان بیٹھی ماں پوڑے کا آٹا گھولن۔ باہر بیرے نے آواج نکالی، کھر والوں کو آلاوول سنانے لگا۔ آواج سن کر میرے تو ہاتھ نہ چلیں۔ پاؤں ہمیں نے پکڑ لئے۔ دل کی آواج کانوں کو آنے لگی۔

بیرا جانے کتنے پوڑے کھا گیا۔ ہر برکی سنگ اونچے اونچے بولے ”واہ!.....“ ہم چاروں کھی کھی ہنسنے لگیں۔

جب بیرا لاہور چلنے کو ہوا تو تاؤ بولا..... ”لے بھائی بیرے! ہم سارے اُجڑ بگڑ کے ادھر آئے رہے، بڑی بوڑھیاں ہماری مرکھپ گئیں۔ پر سرع میں کیسی سرم۔ تو اپنے منہ سے بول، تیں کو کون سی اچھی لگی چاروں ماں سے؟“

بیرا گھنی دیر چپ رہا، پھر بولا..... ”اچھی تو ساری ہیں پر لے تو بنے پوچھ ہی لیا تاؤ۔ جمیل تو میں کو اس کا ہاتھ پکڑا جس نے یہ بیٹھے ریلے پوڑے پکائے..... جو کبھی ہاتھ چھوڑ دوں تو بیرا نام نہیں.....“ ”وہی اس کے بعد تو بیاہ تک سب ہی مجھ کو پوڑے والی پکارا کریں چھیڑنے کو۔ تاؤ کی تینوں دھیاں نے میرا نام جو بیدہ پوڑے آلی رکھ دیا۔

پھر بات تو ادھ میں رہ گئی..... اس بڑھاپے کا ستیاناس مارا جائے۔ کبھی کچھ یاد آوے کبھی کچھ۔ پوری بات خود کو یاد نہ آوے تو تاؤ کو کیا سمجھاویں! ہاں تو تاؤ سن:

دھیاں جنوائی لے گیئوں اور بہواں لے گیئیں پوت  
او رے، بیرے جانگی! تم رہے اوت کے اوت

بیرے جانگی کو معلوم ناں جو بہواں نے پوت ہی لے جاویں تو جان بچے۔ وے تو بیاج، اصل کوڑی کوڑی سمبر لیں۔ پائی نہ چھوڑیں کسی کے ہاتھ..... میں جو آنگن میں چاروں ریگتے کرلاتے بچوں سمیت آئی تو بڑا ”ابا ابا“ کہہ کر بیکے، سنا نہ جائے۔ جوانی میں بیرے کی آواج کھڑک دار باجے بھرے ڈھول جیسی ہوا کرے۔ اب تھوڑا گلا بیٹھ گیا، پر اب بھی اس کی آواز میں آلاوول سن کر پاؤں دھرتی سے نہ اٹھیں۔ رکتا پڑے۔ اندر گھس کر دیکھوں۔ بیرا بنیان دھوتی پہنے چولے کے پاس رنگیلی پیڑھی پر بیٹھا گئے۔ اس کا گہرا سانولا گہرو رنگا کھ چھیر کی چھاؤں تلے خوشی میں دھکتا ہووے۔ سر پر وے نے مندی لگا رکھی۔ سلور کی بڑی تھالی میں بڑا گول پوڑا لئے چسکوں سے کھائے رہا۔ زنت نے چولے پر تو اچڑھا رکھا میرے چیز کا۔ نواں تو اچولے پر چڑھائے رہا اور پان کے پتے سے پوڑا برابر کر رہی۔ مجھے دیکھ آکھیں گالاں سے لگالیں۔ چوراں مانق نظر نہ اٹھائے۔ بچے پکوان دیکھ ماں پر لپکے۔ بھول بھال گئے کون سی دادی کیسی دادی! ماں نہ بولے نہ چالے بس پوڑا سدھراتی جائے۔ مجھے دیکھ کر ناں بیرا بولا..... ”ادھر آجا جو بیدہ..... لے ری شتابی آ۔ ہمارے تو بھاگ کھل گئے۔ کیسی سیکھی سکھائی جنت مل گئی۔ ہم نے تو ساری جندگی پوڑے میں انڈہ نہ ڈالا۔ اس نے سالم چار انڈے ڈالے پھینٹ کر۔ کھا کر دیکھ کیک کا سا مزہ آوے۔ تو بھی سیکھ لے اس سے۔ کیا غضب ڈھائے رہی، ایک سے ایک گول رسیلا پوڑا..... واہ..... واہ“

بچے سب سے پہلے پہنچے۔ پھر میں گود والے کے ساتھ چھیر تلے گئی تو بڈھا بیرا پھولوں والے روغنی پیالے سے سڑک سڑک چائے پیوے تھا۔ سانولا گہروا رنگ دغ دغ کرے تھا، شام سے کی سرخی جیسا..... ”یہ ساتھ والی کشمیر سنگ سبز چاہ بنانا سیکھ آئی ہماری جنت..... گھونٹ بھر پی کے دیکھ جو بیدہ..... ہماری تو قسمت جاگ گئی بھلی لوک..... عیش ہو گئے عیش۔ ریلے پوڑے..... سبز چاہ..... واہ..... واہ..... واہ“

پھر بیرے نے بڑی چاہت سے میری اور پیالہ بڑھایا۔ وہ تھوڑا بہت لجا گیا..... ”لے پی..... دیکھ جو بیدہ سورگ کا جھونٹا ہوئے رہا.....“

پر چوڑیاں بھی سینت سینت وہی ڈالے تھی۔ صاف کو ہلکا لگانا مٹی دھول میں سنی جتی کو صاف کرنا کانٹاں کی بالیاں چکانا سب کام چلتی پھرتی ترنت زنت کر دیتی۔ اور ہر کام میں ستھرائی صفائی سکھڑپن.... ماں کی کھال اُدھڑنے کو چاروں روں راں بچے آگے پیچھے رہ گئے۔ بال کھنچیں، دھمو کے ماریں، سلیر چھپاویں، تکیہ گھا کر سر میں ماریں، کھوپری ہل جاوے میں بڑھیا کی.... "تس پر نہ مارنے کی اجابت نہ گھر کنے کی۔ ترسیلا بھیرا ڈھے ڈھے جاوے، رو رو بولے.... "اور ری جو بیدہ! ہمارا غنی کا گھر، تیں ان مجلوم قیہوں کو برا بھلا کہہ کر کیوں عاقبت برباد کرنے بیٹھ گئی؟ انتر کو کیا جباب دے گی پاک رسول کوں؟"

دیکھتے دیکھتے میں جو بیدہ سے بڑھیا ہو گئی۔ جب بلاوے بھیرا، بڑھیا کہہ کر آواج دے۔ سوچوں تو میں تو ایسی چھڑیا ہوئے رہی جس کا سارا لینے والا کھاٹ کا ہو رہے۔ کونے میں کھڑی، جلے میں تئی۔ کبھی نالی کھولنے، کتے بھاگنے، بچے دھمکانے، فقینی ڈرانے، چھپکلی مارنے کو چھیڑا اٹھائی، پھر کرموں جلی کونے میں اچاٹ من کھڑی کی کھڑی۔ بھولی بری کی کوئی بات نہ پوچھے!

سروع سروع میں جب زنت کو دندل پڑا کرے تو بھیرا ترنت میں کو آواج دے۔ پھر ہولے ہولے وہ خود ہی کافی ہو گیا۔ بھیرا مرے جاہد کو رونے لگتا تو زنت میری ہو آواہیں دے کر بلاتی۔ کچھ دنوں بعد اس کوں بھی چپ کرانے کا ڈھب آ گیا۔ چادر تان کر سونا کھتم ہو گیا۔ سوکھی ڈالی ہری ہونے لگی۔ زنت پاؤں کی ہلکی، ہاتھ پیر کی چست رہی۔ سارے گھر میں پھر کی سی گھوہے پھرے۔ کبھی پنڈلی کھجلائے کبھی سر، کبھی تالی بجائے کبھی چنگی۔ چلے تو لمبا پراندہ کبھی دائیں کولے پر کبھی بائیں چاٹتا ہوا.... آواز میں ترنگ، آنکھوں میں لو۔

بھیرے کو رات دن ہو بچوں کی دبہا، ان کا دھیان.... سارا دن کبھی سکول، کبھی کھلونے، کبھی چاٹ مسالے چارپائی پر دھرے بولے.... "اور ری جو بیدہ اٹھ کچھ ہمت کر بے چاری سارا دن اکیلی جان کھپاوے۔ بھلے جو اس کے گھر والے کل کو سنیں تو کیا کہیں! کوئی نوکرانی تو ناں لائے ناں۔ دو چار برتنوں کو ہاتھ ڈالے تیرے ہاتھ تو نہ گھس جاویں۔"

سرم کی ماری میں بڑھیا اٹھوں۔ سارا کھرا تھالی کنوریوں سے بھرا مانجھ مونجھ رکھوں۔ پرات ہانڈیاں دھو ہٹا کھانے پر رکھے جاؤں۔ بھیرا گھر لوٹے تو جلدی پیڑھی گھیٹ

پل بھر میں میرے پاؤں جمیں نہ پکڑیں۔ ساری دہرے ریت کی بن گئی۔ میں کمرے بھیتز جانے کو چاہوں.... "بس بھیرا میں کوں تاپ چڑھنے کو آوے، لیٹن دے.... ہڈی ہڈی دُکھے آج تو۔"

ان دن سے میں آناڑی کا چولہا چوکا چھوٹا۔ زنت ہو کو کبھی پیاز چھیل دیے، کبھی آٹا گوندھ پرات دھو دیوار سے لگائے دی۔ سل بٹے پر مسالہ بنائے دیا.... ہاتھوں سے ڈوٹی چھوٹ گئی۔ پیلے پیل جھوٹ موٹھ کمر درد سے پڑی رہوں۔ پھر چاروں بچوں کی گھیٹ اٹھانے کمر میں درد ٹھہرائے دیا۔ کھاٹ ہی اچھی لگے۔ ہوں ہوں کروں تو آرام آوے۔ پھر بھی بھیرے کا حق تازہ کر کے اس کے آگے دھروں۔ ایک دن نیم تلے کھاٹ پر پڑی سوتی رہی۔ زنت نے حق تازہ کیا، لال انگارے چلم میں دھرے اور دھو مانجھ کر حق بھیرا آگے کیا۔ بس گڑ گڑ کی آواج سن کر جاگی۔ آنکھ کی جھری سے دیکھا۔ مہندی لگے لال لال بال، گیروے سانولے رنگ میں کونے دکھیں۔ بھیرا بولا

"واہ جنت تیں اس حق پر بھی جادو کر دیا...."

"کچھ نہیں گلزارو کے دادا.... گندا تھا، مانجھ دیا۔ چلم میں بھی راکھ بیٹھی ہوئے، وہ بھی جھاڑ دی۔"

"ناں ناں.... مانجھنے سے کوئی خوشبو تھوڑی آنے لگے.... میرا تو سارا سینہ خوشبو سے بھر گیا۔ بھلی لوک گلاب کا تختہ کھل گیا بھیتز...."

"گلزارو کے دادا تھوڑا عرق گلاب ملایا تھا حق تازہ کرتے سے، اس کی خوشبو ہو گی۔" زنت بولی۔

"عرق گلاب تیں کوں کہاں سے ملا....؟" اٹھا گا رنگیلا بولا۔

"لے بھول گیا؟ پچھلے بدھ کو لایا نہیں تھا تیں جب گلزارو کی آنکھیں دُکھن آئیں۔"

"ہاں بھئی ہاں لایا تھا۔ بڑی سکھڑوتی ہے تو زنت۔ ساری چیز وستو سنبھال لے، کچھ ضائع نہ کرے.... ہاں جی ہاں لایا تھا لایا تھا"

تس دن بعد قسم یسو جو بھیرے کا کوئی کام میرے بچے لگا ہووے۔ ہولے ہولے زنت نے کئی چنگ کی ساری ڈور سمیٹ اپنے کھیسے میں ڈالی۔ لمبے باجو کی آستین میں کلائی

چندن نے ماچس کی تیلی دانتوں میں پھرائی، پھر ڈکرائی اور بولی ”جب سے میں آئی رہی، ایک ہی بات دیکھوں بھیا۔۔۔ کام بہت ہے جنت کو۔ شادی سے پہلے یا کھیلے یا منجا توڑنے۔۔۔ میں مانوں بڑا پہاڑ سا دکھ ٹوٹے اس پر۔۔۔ پر تیں بھیا کالج کی گڑیا کے پلید بلی بنادی نالیاں میں منہ مارنے والی۔ جو تہ آگیا دے تو مہینہ دو کو لے جاؤں اُسے۔۔۔ جراجان انگڑی ہو جاوے تو لے آنا۔۔۔ کوئی سدا سدا کو نہ بٹھار کھوں اپنے پاس۔“

بیرا چارپائی سے اٹھا۔ اب تو اس سے بیٹھا نہ جائے ”لے یہ چلی جاوے تو ہم بڑھوں کو کون دیکھے۔ جو بیدہ کی تو کمر حجاب دے گئی، مردے تان پڑی رہوے ہے کھات پر۔۔۔ اب تو چندن اس کا ہمارا ایک پنتھ۔۔۔ ایک ڈار کے پیچھی کب جدا ہوویں۔ پر جو کوئی تنگی ہو تو بتلا دے، اپنے پلے برابر تو میرا وعدہ پورا زور لگاؤں۔“

چندن بی بی کئی کروٹ بیٹھی، پھر ہاتھوں کے کڑا کے نکالے اور آخر کو بولی۔۔۔ ”لے بھائی! بیرا! وہ باقی سب تو جنت کے بس کا ہے۔ کام کاج میں بھی وہ بیٹلی ناں۔۔۔ پر روپے دو روپے کو بھی ہاتھ پھیلا نا کبھی ساس آگے کبھی تیرے۔ اس نے تو جلد موہرے بھی ہاتھ نہ پھیلائے کبھی۔ آخر ہم بھی راجپوت ہوئے رہیں، ہم کو بھی آن نے مارا۔۔۔ لے تو انسا پھ کر دے۔ روپے دو روپے واسطے کوئی ہاتھ جوڑتا ہے۔ جمانہ بدل گیا بیرا۔ آج کون گھر کا خرچ مانگے روج روج۔۔۔ سارا سال؟“

”لے یہ بات ہے تو اس کا بھکر نہ کر چندن۔۔۔ میں ساری پنسن جنت کے ہاتھ پر رکھوں ہوں آج کے بعد۔۔۔ لے تو لمبی بات چھوڑ۔ میں کل ہی پنسن چڑھاؤں جنت کے نام۔ آپی لاوے، آپی خرچ کرے۔ ہم دونوں کو کیا لینا ہے پنسن سے۔ کیوں بڑھیا؟ دو وخت گی سوکھی روٹی بھی دے تو دُعا پاوے۔۔۔ ہمارا کیا کام پنسن سے۔ لے میں ٹٹا ہی مکاؤں۔ آج سے پنسن تیرے نام ہوئی دنت۔ کھلا لا۔۔۔ سب کو کھلا۔ اللہ اللہ کھیر سلا۔“

لے اب تاؤ کو کیسے بتلاؤں!۔۔۔ ساری عمر میں کو پتا نہ چلا کہ بیرے کی تنخواہ کتنی ہووے۔ رینار ہوئے پر پنسن نہ دکھائی کبھی۔ روپیہ دس روپیہ اکٹھے دے دیتا۔ گھر چلتا جائے قطرہ قطرہ قدم قدم۔۔۔ کبھی پچاس روپے کا نوٹ بھی نہ دیا کبھی ساتھ اور پنسن ہو کے نام لکھوانے پر راضی خوش۔۔۔ تھرکتا پھرے!

انہی گھر پر جاگ نہ ہوئی تھی۔ میری کھات پر چاروں بچے اوندھے سیدھے پڑے

کھرے میں جا بیٹھے زنت بی بی۔ بیرا آگے بڑھے تو لمبی آہ بھرے۔ زنت کبھی منہ پر آئی لٹ پرے کرے، کبھی پاؤں دکھ سے کھجائے۔ گڑیا سی بن جائے، پلکیں جھکائے۔

میں نیم تلے کھات پر لیٹی چاروں بچوں میں گھری۔۔۔ سوچوں تو زنت کا بڑا دکھ لگے، نہ سوچوں تو اپنا دکھ اٹھائے نہ اٹھے۔ سارا دن میں مرن باری کو نہ جلد کا غم نہ راج پاٹھ چھن جانے کا روگ۔۔۔ چار آفتی بچے اپنے بھاگ پھل کو روئیں، میں کو جھنجھوڑیں، توڑیں، مانو پرانی لاش کو گیدڑ۔۔۔ ہے ہے ماروں تو کھوڑ۔۔۔ لاڈ کروں تو بگاڑنے والی۔۔۔ سوچوں تو اپنے پر ترس آوے، نہ سوچوں تو اوپر والے بلوان سے لڑا نہ جائے۔

پھر سردیوں کے دن آئے۔ ٹوٹی پھوٹی راجائیوں میں تن ٹھنڈا رہوے۔ رات پانی کے گھرے باہر ہوویں تو صبح کرا جے ہوئے ان میں۔ ان ہی ٹھٹھرتے دنوں میں زنت کی مہیا بی سے ملنے آئی۔ وہ بھی ہرن مینارے کے پیچھاڑے نئی بستی میں رہوے، تاؤ کی بستی سے میل بھر دور۔۔۔ کیسری جوڑا، مینڈھیاں گندھی ہوئی۔۔۔ گلے میں چاندی کا زیور۔ چلے تو پازیب بولے، بیٹھے تو ہاتھی دانت کا چوڑا کھنکے۔ جنوائی اور گھر والا ایک سال مرے، پر وے کے کوئی مرے ہووے کے ساتھ تھوڑا مر جابوں لوگ۔۔۔ جندہ ہوویں تو جندہ لوگوں کی آگیا لے کر تو نہ جیویں۔ چندن بی بی تو نکھری نکھری جوان، مدھ بھری نجر آئی میں کوں۔ کچھ بروج دانتوں میں ماچس پھیرتے، لمبے لمبے ڈکار لیتے، بستی والوں کی باتاں لرتے ہمارے گھر گزری۔ پھر ایک رات جب سارے کمرے میں بند کھانوں پر آدھی خیندوں میں ڈٹے رہے ناں تب چندن بی بی کا چوڑا چھٹکا۔ وے بھی پلکیں جھکا گالوں سے لگا لڑیا بن جاوے۔ بولے۔

”دیکھ بھائی! بیرا لوکاں کسے ہیں۔ بات دل میں نہ رکھو، خیر لگ جاوے بات کوں“ بیرا چارپائی پر لیٹا حقہ گڑ گڑائے۔ ٹھونکے کیل سا اٹھ بیٹھا۔ ”چندن! ہن! بول بول، کیا بات ہے۔ دل میں نہ رکھ۔۔۔ یہاں کون سا غیر ہوئے رہا۔“

”چل رہیں دے بھائی! بیرا۔۔۔“ پازیب چوڑا سنگ سنگ بولا۔

”ناں اب تو کہہ گزر۔۔۔“ بیرا بولا۔

سوچوں تو بھلا کوئی عورت بولا کرے اور مرد کے کلن نہ سیں۔۔۔ نہ سوچوں تو نہ کوئی سنے نہ کوئی بولے، بس ایک رولا پڑا رہوے جگ میں۔

سال گزرے پر تاؤ نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ ایک دن تاؤ کی منجھلی بھی اُجڑ کر آ رہی تو اُسے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر کرتے تاؤ بولا..... ”پتہ نہیں جمانہ بدل گیا کہ ایدھر کے دانہ پانی میں کچھ ہے۔ کچھ موسم بدل گیا، میرے گھر کی لڑکیاں کٹھور ہو گئیں۔ منجھلی کی آنکھ بھی جو بیدہ جیسی کٹھور ہو گئی۔ تیں سے تو بھیرا اچھا جو بیدہ، ساری پنشن زنت کے نام لگوا دی..... کھد جگ جاوے زنت، کھد پنسن لاوے۔ سنا ہے ایک کوٹھڑی کبھی نہ مانگے ہو سے..... مرے بیٹے کا حق ادا کر دیا۔ سنا ہے چار میل پر بچوں کا سکول ہے۔ کھد چھوڑنے جاوے، کھد لینے۔ سب سے کتنا پھرے ہے میرے جاہد کا ڈکھ زنت کے دل سے ڈھل جائے تو سمجھ لیو میں جیتا بچا۔ زنت کے بچے پل جاویں، لکھ پڑھ جاویں تو جان لیو بھیرا مکت ہوا.....“

اب تاؤ جمیل کو کیسے بتلاویں ساری عمر ایک دن پوری تنخواہ ہتھیلی پر نہ رکھی بھرے نے تو پنسن ہوئے پر کیسی پنسن؟ کس کی پنسن؟ جو روئیں تو کس کے آگے، نہ روئیں تو سارا بدن آنسو بن جاوے۔ جی میں راک کھیال رہو وے تھا کہ آج بھیرا آوے گا..... صبح کی شام کروں، شام کی صبح..... کہیں دھیان میں راک بسواس تھا کہ جیسے میرا جاہد تنگ تھا زنت کے ہاتھوں ویسے ہی بھیرا بھی تنگ آ جاوے کہیں۔ پر مرد جات جو پہلی سنگ نہ کریں وہی دوجی ساتھ جرور کریں۔ دوجی کا لاڈ نخرآ جرور اٹھاویں۔ تاؤ جمیل بتائے رہا قرض اٹھا کر بھرے نے چاندی کی بنسلی بنا دی زنت کو..... بے رت کی سبزیاں لائے بھیرا..... کپڑا بھی زنت ریشمی پنسنے، ناک میں لونگ بھی ڈال رکھے..... میرے جاہد سنگ زنت مرنے تھوڑا لگی ہووے..... چندن ٹھیک کھوے تھی۔

جب تاؤ کی تینوں اُجڑ کر کوٹھڑی میں آ بسیں تو سردی کی ایک رات تاؤ کھل کی بکل مار دہلیز میں آ بیٹھا۔ دیر تلک گڑگڑی پیتا رہا۔ پھر ہرے چاند کو دیکھے آہ بھری اور بولا..... ”پتہ نہیں یہاں کی مٹی میں کچھ ہے یا پھر جمانہ بدل گیا..... تم چاروں کی نگر کٹھور ہوئی۔ جو تم چاروں میں سے ایک بس جاتی تو نے تمہاری تائی کا غم بھولے۔ پر آدم زاد کا کیا ہے..... اللہ کی مٹی میں شیطان کا خمیر..... پھولے ہی پھولے وقت کے ساتھ ساتھ.....“

لو سنو میری جانیو..... اور تو بھی سن میرے بھائی کی اکلوتی نشانی جو بیدہ! جب میو جاتی ادھر کو چلے تو پتہ نہ تھا کہ ہر جائے ہیں اور کاپے کو جائے ہیں۔ راستے میں تین بیٹے

ہوویں۔ رات کو نیم تلے چٹائی بچھا میں گچھا پچھا پرانی درری اوڑھ سوئی۔ ابھی اذان نہ ہوئے تھی۔ میں خرچ کے بچے پیسوں کو جوڑا۔ بانئیں روپے کی اٹھنیاں چونیاں چراگ کے پاس طاق میں رکھ دیں۔ اپنے دو جوڑے گٹھڑی میں گانٹھے، ہرا دروازہ کھولا..... اور تاؤ جمیل پاس منسراج کے پچھواڑے میو لوکاں کی بستی میں آ رہی۔

تاؤ جمیل نہ پوچھا کب آئی، کب جائے گی۔ تاؤ کبھی سوالاں میں پڑا ہی ناں..... بس کوٹھڑی کھول کر بولا..... ”تیں کو جب تک رہنا ہو، رہو وے جا جو بیدہ، پر تیری آنکھ بتاوے تیں بھرے پاس جانے والی ناں۔ جو میری مانے تو شام کو واپس لے چلوں۔ میرے سامنے بھیرا اونچا سانس نہ لے۔ پر جو لاد بن ماں باپ پلے، وے کی آنکھ میں کٹھور تا ہووے تیرے جیسی..... میں بھلی لوک تیں اپنا جاہد بھی یاد ناں، تیں ہو کا ساتھ کیا دیوے؟ میو جاتی کی سوانیاں تو بھولے سے بھی گھر والا نہ چھوڑیں..... یہ نئی مٹی کا اثر ہووے، جمانہ ہی بدل گیا..... نئی رت نئی دھرتی..... تیری نجر تو تلوار بھئی..... لے لیٹ جاہ میں روٹی لاؤں۔“

میں تاؤ کو کیا جباب دوں؟ کھاٹ پر ڈھیر ہوئی رہی۔ سوچوں تو ساری دنیا اندھیر ہو گئی، نہ سوچوں تو سارا بدن ہولے ہولے سینک دے، اندر کا سوچنا بند ہو جاوے۔ ایسے ویسے میں کئی سال گزرتے۔ میں کو ملنے بھیرا آیا آتا، وے تو تاؤ کو دیکھنے بھی نہ آیا۔

سالاں پیچھے بارشوں میں ہرن مینارے کی دیواراں ماں دراڑیں پڑ گئیں، پر سرکار کو سالاں بعد کھبر ہوئی۔ اس کے کارندے آئے، باہر کی دیوار تہو تھمبو کر کے اساری۔ پر منسراج کی لاٹ سے جو اینٹیں گریں، ان کا کسی کو ہوش ہی ناں۔ اینٹوں پر کھلیاں چڑھیں، گدھے رینگیں۔ مرے ہرن کا جو سینک ہووے تو مرے راجہ جمانگیر کو..... پڑھی لکھی سرکار کئے کون ہرن؟..... کون راجہ؟ منسراج کی لاٹ ساری ڈھے جاوے تو سرکارے دربارے خبر نہ پہنچے۔

سوچوں تو آدمی کا من بھی زمانہ ہے، جو بھول بھال جائے تو پچھلیاں باتاں خواب میں بھی نہ آویں..... کون جو بیدہ کیسی جو بیدہ؟..... پر جو نہ سوچوں تو اپنا پچھلا وقت لمبی پر چھائیں بن کر ساتھ رہے..... اٹھوں بیٹھوں سوؤں ساتھ رہے..... نجر سے اوچھل ہو تو خواب میں گھس جاوے۔

نکلی۔ بستی کے گھروں سے نکل کر من سراج کی لاث اور بھاگے گئی۔ ساری سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ گئی۔ آخری جھروکے ماں سے ہرن مینارہ نجر آوے سارے کا سارا۔ اس سے ماں بھترے ایک مین نکلا۔۔۔ میں اُونچے روٹی پہلی بار ”اومیا تیں نے راہ میں گردن کٹا۔ بیٹی کی کوئی سدھ نہ لی۔ جو کہیں میں کو پوڑے پکانا ہی سکھا دیتی تو میں بیسرے کے ہاتھوں نہ مرتی۔۔۔ اپنے کے ہاتھ سے مرنا کتنا مشکل کام ہے۔۔۔ یہ تیں کوں کیا پتہ ماں۔۔۔“ میں ابھاگن کی چیخ دور راجہ جھانگیر کی سکار گاہ تک سسکارتی گئی۔

دن چڑھے بستی سے اجان کی آواج آئی تو میں لوٹی۔ کھاٹ پر لیٹن لگی تو میں کوں منجھلی نے بتایا تاؤ تو آدھی رات کا میں کو ڈھونڈن نکلا ہووے۔ لوجی اس رات بعد نہ تاؤ ملانہ اس کی پرانی لائین۔ بہت ڈھونڈن نکلے بستی والے پر تاؤ ہم چاروں سنگ نہ پھٹکا۔ گاؤں والے بولیں جس رات منسراج کی لاث میں ہرن کی آتما آوے، چیتل مستی میں دکھ بھری آواج نکالے وے رات کوئی مسافر رستہ بھولے۔ سوچوں تو کبھی کبھی من کا دیا بڑی آندھی میں نہ بجھے۔۔۔ اور نہ سوچوں تو من سراج کے منہ کی آئی ہائے جندگی کی آس بھادے۔۔۔ سوچوں تو تاؤ میری چیخ پہچان کر نکلا ہووے، نہ سوچوں تو لگے تاؤ جمیل کا گھور اندھیرا اسے اوجھل کرے ہم سے۔۔۔ اس کے من کا چراغ سالوں پرے بجھ گیا تو وہ کیسے گھر ڈھونڈے اپنا۔ لوجی آدی جب بھی چلے اپنے من کے اُجالے ہی میں تو چلے ناں؟

میں گنوائیں۔ جو بیدہ کے ماں باپ گل کٹینن نے ڈھیر کر دیئے۔ ادھر آئے تو ہانک کر لوگاں نے سٹخ پورہ میں لا ڈالا۔ یہ جو سانسے ہرن مینارہ نجر آوے تو یہ شکار گاہ ہوا کرے راجہ جھانگیر کا۔۔۔ جب بادشاہ کشمیر جاوے ادھر تک کر شکار کھیلے۔ ادھر کوئی بستی شہر نہ ہووے تب، جنگل اُجاڑ۔ بڑے لوگاں کی بڑی باتاں۔۔۔ بادشاہ کے پاس ایک کالا ہرن ہوا کرے، ریشمی کھال والا کالا چیتل۔۔۔ ہرن پر راجہ کی نجر نکلی رہووے۔ پل کو جدا نہ ہووے۔ ساتھ ساتھ رکھے چیتل من سراج کو۔ ہرن بھی چوکس، چونچال۔ کبھی قدموں میں لوٹے، کبھی نجر کا بان چلاوے۔۔۔ ایک دن صبح سویرے راجہ جھانگیر سکار کو نکلا۔ سگی ساتھی ساتھ بندوق اٹھائے۔ رانی نور جہاں گھوڑے پر سوار۔ صبح ابھی آندھی رہی، جیادہ روشنی نہ ہوئے تھی۔ بس آدھی روشنی ماں تارے آنکھیں ماریں۔ جنگل بیابان۔۔۔ ایک ہرنوں کی ڈار گجری، راجہ جھانگیر نے بندوق داغی۔ سارے ہرن بھاگے رہے، ایک ڈھیر ہوا۔۔۔ گھوڑے دوڑائے سگی ساتھی بھاگے۔ خود راجہ سکار تک پہلے پہنچا تو میری جانیو!۔۔۔ اور میرے بھائی کی آکھری نشانی سن! اپنی گولی سنگ راجہ نے لے پالک من سراج ڈھیر کر لیا۔ راجہ نے سینہ پیٹ لیا۔ کشمیر جانے کا کھیال بھولا۔ خود اُٹھا کر ہرن مینارہ لایا من سراج کوں۔۔۔“

منجھلی نے گرمی کھائی۔ پتہ نہیں مٹی کا اثر ہوئے رہا کہ جمانہ بدل گیا۔ وے بولی۔۔۔ ”ناں اباتیں کو گلتی لگ رہی۔ من سراج گولی سے نہ مرا۔ وے تو بہت دیر بیمار رہا۔ بڑے حکیم بید آئے، آخر کو مر گیا۔“

تاؤ جمیل بھی گرمی کھائے رہا بولا۔۔۔ ”تیں کو جیادہ پتہ ہے کہ ماں کو؟ جیادہ پتہ رکھنے والیاں لوٹ آویں ہیں گھر کوں۔ گولی لگی جب میں اس گھڑی منسراج کے منہ سے آواج نکلی۔۔۔ دکھ بھری۔ سنا ہووے جب کالا سیاہ چیتل مستی میں ہووے ناں تب ایسی آواج نکالے۔ بھلا راجہ آواج نہ پہچانے اپنے چیتل کی۔ من ہارا بھی دکھ میں نہ رویا۔۔۔ مستی میں رویا۔ راجہ نے من سراج کو سینے سے لگا کر تین کیا۔۔۔ لے بھائی مرنا کوئی تیرے سے سیکھنے۔۔۔ پریم میں نہیں کٹانا تو کچھ اور ہی مجا دے۔۔۔ اپنے پیارے کے ہاتھوں مرنا تو ہر ایک کے بس کی بات ناں۔۔۔ پر تم چاروں کو کیا پتہ۔۔۔ من سراج کا بین کیا تھا!“

منجھلی چاند اوجھل ہوئے پر بھی لڑے تھی کہ تاؤ سگھ کھائی سنائے رہا۔ پر میں باہر